سلمیٰ اختر

اختر شیرانی

نیّر واسطی

سنہ ۱۹۵۰ء

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کبیر سٹریٹ اردو بازار
لاہور

بارِ اوّل .... قیمت ۸؍

مطبوعہ حجازی پریس لاہور

تعارف

شاعر رومان حضرت اختر شیرانی مرحوم کی داستان عشق آج افسانۂ بزم و انجمن ہے ۔ اور قبلہ حکیم نیر واسطی صاحب نے ان اوراق میں اس حکایت لذیذ کو قلمبند کرکے درحقیقت دُنیائے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

حکیم صاحب ممدوح اختر کے عزیز ترین دوست ہیں اور ان تمام اسرار و حقائق سے باخبر ہیں جو اختر کی رومانی شاعری کے فیضان کا باعث ہیں۔

پس عصر حاضر میں اختر پر ادب اردو کا یہ پہلا رنگین اور دلکش مقالہ ہے جو درحقیقت شاعری ہی کی زبان میں لکھا گیا ہے جہاں آپکو اختر و سلمیٰ کی داستان محبت سے روشناس کرائے گا وہاں اُن سوانح و حالات سے بھی آگاہ کرے گا جو مرحوم کی رومانی شاعری کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

ہمیں توقع ہے کہ حکیم صاحب قبلہ کا یہ بلند پایہ ادبی اور تاریخی مقالہ ملک کے اعلےٰ علمی اور ادبی حلقوں میں خاص دلچسپی سے مطالعہ کیا جائیگا:۔ ناشر۔
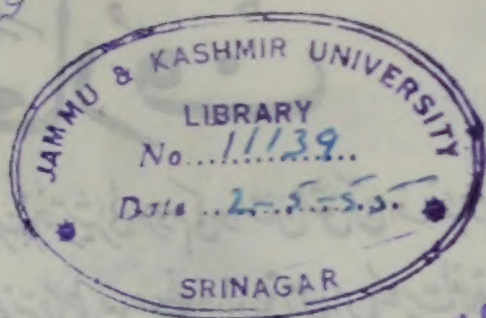
کتاب ہذا کے ملنے کے پتے

(۱) کتاب خانہ نورس کاپی بک شاپ کبیر سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

(۲) مبارک کمپنی لاہور۔ محلہ وسن پورہ۔

(۳) تمام دوکانداروں سے بھی مل سکتی ہے

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگئی خویش کہ کارے کردم

شہید عشق حضرت سلمیٰ اختر شیرانی
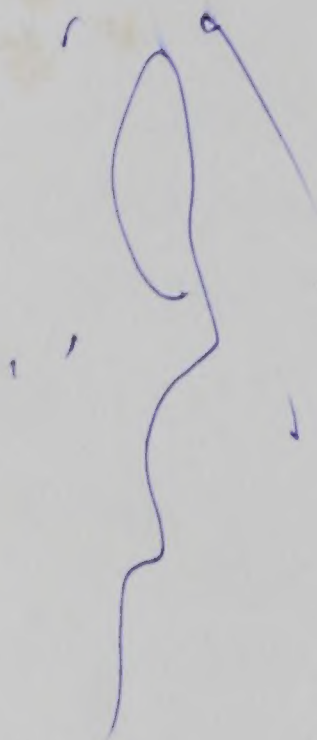
نقش جمیل

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

...میں ایک نظم کی صورت میں اختر شیرانی مرحوم کے ایک خط کا
...پیش کیا جاتا ہے جو مرحوم نے سلمیٰ کی عیادت کے سلسلے میں
...تھا

ن و

عیادت

...رستی کا گلہ کیوں ہے، شکایت کیا ہے؟
میری بیمار، بتا تو، تری حالت کیا ہے؟

...شق بیماری ہے اور کتنی حسیں بیماری
کیا خبر بے خبر دل کو کہ یہ لذت کیا ہے!

...ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب!
آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے!

...ر و دئیے جب بھی سنی درد بھری کوئی خبر
درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے؟

...ان کی صحت کی خبر آئے گی، جلد آئے گی
دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے!

سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں اُن پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے؟

۱

اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِی اَدِرْ کَاْساً وَّ نَاوِلْهَا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا
بہ بوئے نافہ کاخر صبا زاں طُرّہ بکشاید
ز تابِ جعدِ مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا
بمے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا
شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا
ہمہ کارم ز خود کامی بہ بدنامی کشید آخر
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

مشرق میں رومانی شاعری کے تین پیمبر آئے ہیں۔ ایک امرء القیس دوسرا حافظ شیرازی اور تیسرا اختر شیرانی جس کی زبان حافظ کی تھی اور تخیل امرء القیس کا مدت ہو چکی تھی کہ دختران صحرا کے خیمے اور ریت کے ٹیلے پھر کسی آتش نوا شاعر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اور زمانہ گزر چکا تھا کہ ریگزار عرب کی وادیاں عُنیزہ کے غم ہجر و فراق میں امرء القیس کے نالہ و بکا کی صداؤں سے محروم تھیں جو دشتِ عرب کو راہب کے مقدس چراغ کی طرح روشن کئے ہوئے تھی کہ

۵ تضئ الظلام بالعشی کانها   منارة ممسیٰ راهب متبتل[1]

کعبۂ عبادت گزارانِ عشق مدت سے سُونا پڑا تھا، اور زمانہ ہو چکا تھا کہ مکہ میں داستان سرائی کی مجلسیں آراستہ نہیں ہوئی تھیں۔ ۵

کان لم یکون بین الحجون الی الصفا   انیسٌ ولم یسمر بمکة سامر[2]

پھر صدیاں گزر چکی تھیں کہ شیراز کی حال و قال کی محفلیں ویران پڑی تھیں اور مدت ہو چکی تھی کہ ساحلِ رودِ ارس پر بسنے والی سلمیٰ کے پاس کتار رکنا باد

---

[1] امرء القیس کا شعر ہے۔ ترجمہ:۔ میری محبوبہ شب کی تاریکی کو اس طرح منور کر دیتی ہے جس طرح تارک الدنیا راہب کی رات کا چراغ دشت کو روشن کر دیتا ہے۔ منہ

[2] عمرو الخزاعی کا شعر ہے۔ ترجمہ:۔ گویا حجون سے لیکر صفا تک نہ تو کوئی انیس باقی رہا اور نہ ہی کوئی مکہ میں رات کو ہم صحبت افسانہ گو رہا۔ منہ

سے حافظ نے صبا کی معرفت اپنا پیامِ محبت نہیں بھیجا تھا۔ کہ ؂

ای صبا چون بگذری بر ساحلِ رودِ ارس   بوسہ زن بر خاکِ آن وادی و مشکین کن نفس
منزلِ سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام   پر صدائے ساربانان بینی و آہنگِ جرس
محملِ جاناں ببوس آنگہ بزاری عرضہ دہ   کز فراقت سوختم اے مہرباں فریاد رس

شراب موجود تھی، لیکن وہ گدائے میکدہ ابھی عدم سے نہیں آیا تھا جو میخانۂ ہستی میں خم کے خم لنڈھائے اور عالمِ مستی میں دنیا کے بڑے بڑے تاجداروں اور کجکلاہوں سے کہے۔ کہ ؂

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بین   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

شمیم آباد گلشنِ ہستی میں شاداب پھولوں کے علاوہ بیمار کلیاں بھی موجود تھیں لیکن وہ سوگوارِ محبت نہ تھا جو ان کے جیبِ پُر درد دل میں سو جانے والی کی رسیلی گود میں مرجانے کے لئے یہ کہتا ہوا آگے بڑھے۔ کہ ع

مجھے تو کچھ انہیں بیمار کلیوں سے محبت ہے

فرہاد و شیریں کے افسانے اب پرانے ہو چکے تھے اور لیلیٰ عشق کو صحرائے جنوں میں پھر کسی مجنوں کی جستجو تھی کہ ؂

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

سر تو موجود تھے۔ لیکن وہ سرِ شوریدہ نہ تھا جو قیس کے سر کی طرح دیوارِ گلستاں

سے ٹکرانے کے لئے آگے آئے۔ دل موجود تھے لیکن وہ دلِ بے قرار موجود نہ تھا جو کیٹس KEATS کے دل کی طرح فینی براؤن PHENEY BROWN کی یاد میں تڑپے۔ کان موجود تھے۔ لیکن وہ گوشِ حقیقت نیوش نہ تھے جو ورڈزورتھ WORDSWORTH کے کانوں کی طرح آندھیوں کی خوفناک سرسراہٹوں میں لوسی LUCY کی آوازیں سُنیں —— —— اور پھر زبانیں موجود تھیں لیکن وہ مئے کوثر میں دُھلی ہوئی لسان الغیب کہاں تھی جو عراق میں سلیمیٰ کی آمد پر یوں نغمہ بار ہوئی کہ ؎

سلیمیٰ منذ حلّت فی العراقِ   الاقی فی هواها ما الاقی[۱]

غرض خانۂ شرع کی طرح عشق کا گھر بھی خراب تھا۔ اور مدت ہو چکی تھی کہ رومانی شاعری کی بساط اُلٹ چکی تھی —— لیکن یہ کسی کی جلوہ گاہِ ناز دنیا پھر کسی امرءالقیس اور حافظ کا انتظار کر رہی تھی اور روہِ چناب جس کی سیمگوں فضا پر کبھی مہینوال کے نغمے لہرائے تھے اب پھر گجرات کی وادیوں میں پُرانے ترانہائے عشق کے انتظار میں گوش برآواز تھا —— کہ یکایک سازِ محبت سے جو مدت سے خاموش تھا نغمے اُبلنے لگے —— اِنتظار کی راتیں ختم ہوئیں

---

[۱] حافظ کا شعر ہے۔ ترجمہ:- سلیمیٰ جب سے عراق میں آئی ہے۔ میں اُس کے عشق میں کیا کہوں کن حالات سے دوچار رہا۔ اِہوں۔ نہ

ہاتف نے رندوں اور مستوں کو سحر دم مژدۂ دولت بیدار دیا، ر چمنستانِ سخن میں وہ مست لم یزل جسے اختر شیرانی کہتے ہیں اپنی لحن داؤدی میں سلمیٰ کے عشق و محبت کے گیت گاتا اور رفرطِ مسرت سے جھومتا ہُوا آگیا —— آہ!

سحرم دولتِ بیدار ببالیں آمد گفت برخیز کہ آں خسرو شیریں آمد

قدحے درکش و سرخوش بتماشا بخرام تا بہ بینی کہ نگارت بچہ آئیں آمد

شادیٔ یار پری چہرہ بدہ بادۂ ناب کز مئے لعل دوائے دلِ غمگیں آمد

حافظ کی جو غزل ہم نے سب سے پہلے بطور عنوان درج کی ہے اور جو اس کے دیوان میں فاتحۃ الکتاب کی حیثیت رکھتی ہے، درحقیقت اُس کی تمام تر حیاتِ معاشقہ کی آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنے عشق کی کٹھن راہ کو آسان بنانے کے لئے جس میں آگے چل کر اُسے بیشمار مشکلیں پیش آئیں شغل مَے و مینا اختیار کیا اور ساقی سے پیہم دورِ بادہ کی التجائیں کیں۔ وہ ساری عمر صبا سے باتیں کرتا رہا اور گیسوئے مشکیں کے پیچ و خم نے اس کے خانۂ دل کو ہمیشہ غم و الم سے آباد رکھا۔ اس نے داغ جدائی کے بعد باقیماندہ زندگی گذارنے کے لئے رندی و قدح کشی کی زندگی جاری رکھی کہ اس کے سالکِ مسالکِ مجاز کا حکم یہی تھا —————— منزلِ جاناں میں اُسے کبھی عیش کی گھڑیاں میسر نہ آسکیں کیونکہ اس کی ساری زندگی راہِ عشق میں سفر

میں ہی گزر گئی۔ یعنی ؎

دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی!

نہ زندگی کی شب تاریک میں اپنی کشتی کو گردابوں کی خوفناک موجوں میں اس حالت میں لیے پھرا کہ سبکسارانِ ساحل اس کی صعوبت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور آخر میں ناکامی کی وجہ سے اس کا کام بدنامی پر منتج ہُوا کہ آخر وہ راز کہاں تک چھپا رہتا جو افسانۂ بزم و انجمن بنا رہا۔

درحقیقت اختر کی ساری زندگی کا خلاصہ یہی کچھ ہے۔

دنیا میں اختر شیرانی کے نام سے صدیوں کے بعد ایک باکمال رومانی شاعر آیا جو بہارستانِ شعر و ادب کے لیے ایک نیا مدرسۂ فکر دے کر آیا تھا۔

وہ ایک درویش تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز درویش جس کی نگاہوں میں خزف ریزوں اور سونے اور چاندی کی ٹکیوں میں کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ ایک دوست تھا، ایک ایسا پاکباز اور بے غرض دوست جس سے زیادہ باصفا اور مخلص دوست ہم نے اس آسمان کی نیلگوں چھت کے نیچے نہیں دیکھا۔

وہ ایک عاشق تھا۔ اور ایک ایسا سچا عاشق جس نے درحقیقت سلمیٰ کے عشق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ کہ

ومن ینکر فلینظر الی فمنظری　　　نذیرٌ الی من ظن ان الہوی سہلؑ

اختر شیرانی سے میری مودت و عقیدت کا سلسلہ تقریباً بیس بائیس سال سے شروع ہوا۔ اور اس کے بعد بہت سے مہ و سال گزرے اور زمانے نے بے شمار کروٹیں لیں۔ لیکن طرزِ زندگی کے شدید اختلاف کے باوجود ہمارے صدق و خلوص میں کبھی کمی نہیں آئی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مراسم و تعلقات روز بروز بڑھتے چلے گئے ؎

بڑھتا رہا جنون زمانے کے ساتھ ساتھ

لاہور میں مَیں نے اور اختر مرحوم نے ابتدائے ایک ساتھ شاعری کا شغلہ اختیار کیا تھا۔ یعنی ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق

دراصل وہ وقت تھا جب کہ غالباً ۱۹۰۵ء کے بعد دنیا پہلی بار اختر کے نغموں سے گونجی تھی۔

اُس وقت اختر کی مشہور نظمیں "جوگن" "انجام ہستی" "تیغ زنی" وغیرہ

ؑ ترجمہ:۔ جو شخص منکر عشق ہے وہ مجھے دیکھے کہ میرا دیکھنا اس شخص کے لئے جو عشق کو آسان سمجھتا ہے خوف دلانے والا ہے۔ منہ

ارباب فن سے دادِ ہنر حاصل کر رہی تھیں۔ اور میری نظمیں "سحرِ موسیقی" "بیوہ کے آنسو"، "حسنِ بنارس" وغیرہ اس وقت کے ادبی مجلات بالخصوص "عالمگیر" کے ابتدائی ماہناموں میں شائع ہو رہی تھیں۔

یہ سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا۔ تا آنکہ اختر اپنے فن میں ترقی اور شہرت حاصل کر کے آسمانِ شعر و ادب کے ماہِ شبِ چہاردہم بن گئے۔ اور ہم دنیا اور دنیا کی مصروفیتوں میں گھر کر اس راہ کو خیرباد کہہ بیٹھے اور اب حالت یہ تھی کہ ع

نہ وہ ذوقِ بزمِ سخن رہا نہ وہ شوقِ کحُلِ بتاں رہا

ہماری شاعری کی معراج اب صرف یہ تھی کہ کبھی کبھار کچھ لکھ لیا اور اپنے دوست کو سنا کر اُسے نذرِ طاقِ نسیاں کر دیا کہ ع

یہ کیا کم تھا کہ اُن سے داستانِ دل بیاں کر دی

اختر کے ساتھ میرے مراسمِ نیاز کی ابتداء کو تقریباً بائیس سال کا زمانہ ہوتا ہے جس کے بعد ان کے یومِ وصال تک جس کو ان کی شاعری کی عمر کا پورا دور سمجھنا چاہئے ان کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے تمام مراحل میری آنکھوں کے سامنے گزرے۔ یعنی ع

ہم رنگِ انقلابِ چمن دیکھتے رہے

ان کے عہدِ جوانی میں (جنانکہ افتدو دانی، فیمنگ روڈ لاہور کے ایک

تنگ و تاریک گوشے کی خلوتوں کے علاوہ گجرات کی رات کی جلوہ باریوں، ایبٹ آباد کی شام و داع کی نالہ سامانیوں، مری کی صنوبرستانی فضا کی بہار فروشیوں اور خصوصیت کے ساتھ باغ لارنس کی چاندنی راتوں کی محفلوں میں سے کوئی بزم رنگ و بو ایسی نہ تھی جس کے محرم اسرار ہونے کا شرف مجھے حاصل نہ ہو ——— آہ ؎

نہ بھولیں گی کبھی اے ہمنشیں! راتیں جوانی کی!
وہ راتیں وہ ملاقاتیں وہ برساتیں جوانی کی!
لبوں پر آہ دل میں دھڑکنیں آنکھوں میں اشک غم
جوانی لیکر آئی تھی یہ سوغاتیں جوانی کی!!!

اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور میرے اختر صاحب کہنے پر اکثر مجھ سے ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ مجھے صرف اختر کہا کیجئے۔ ساتھ ہی انہیں اس قدر پاس خاطر یا لحاظ تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سن پاتے تو بوتل کو جسے وہ دختر گردن دراز کہا کرتے تھے؛ ادھر اُدھر چھپانے کی کوشش فرماتے۔ بااینہمہ لطف یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلف اپنا ہر دکھ درد بیان ہوتا تھا۔ عشق و عاشقی کے تمام فسانے سنائے جاتے تھے۔ جب کسی کوچے میں کوئی کام نکل آتا بالعموم مجھ سے اس کا تذکرہ ہوتا اور اکثر

"ابھی ابھی انہیں مشورہ لینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن ـــــ آہ اس وقت کسے خبر تھی کہ ؎

ہے آج جو سرگذشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی:

مختصر یہ کہ ان کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے اکثر لمحات میرے ساتھ بسر ہوئے اور وہ بیشتر سوانح اور حوادث جو سلمیٰ کے عشق اور ان کی رومانی زندگی میں ان کی نظموں کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں، میری آنکھوں کے سامنے گزرے۔ اس مضمون میں میں اختصار کے ساتھ دنیا کے اس سب سے بڑے آتش نوا رومانی شاعر کی زندگی کی ان رنگین، مگر دل سوز اور دل گداز داستانوں کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا جن کے ذکر سے بستی کی لڑکیوں ہی میں نہیں دنیائے زہد و طاعت میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ کاشانۂ عشق میں آگ لگی اور بالآخر وہ خود بھی اس آگ میں جل گیا جو اس نے روشن کی تھی ؎

سینہ ام زآتش دل در غم جانانہ بسوخت
آتشے بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت

اختر کی زندگی کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ آپ ۴ مئی ۱۹۰۵ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم مبارک حافظ محمود خاں شیرانی ہے۔ اور افغانوں کے مشہور اور ممتاز خاندان شیرانی سے نسبت کی وجہ سے آپ کو شیرانی کہا جاتا ہے۔

آپ کا اصل نام والد نے محمد داؤد خاں رکھا تھا۔ اور بالعموم گھر والے آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ مسعود خسرو آپ کا تاریخی نام تھا۔ اور بعد میں آپ نے اپنا تخلص اختر اختیار کیا اور اب وہ دنیائے ادب میں اسی نام سے مشہور اور متعارف ہیں۔

آپ نے قرآن کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن ٹونک میں اپنے ایک پرانے اتالیق، حافظ منو خاں، سے حاصل کی۔ بعد میں اردو کی ابتدائی کتابیں آپ نے اپنی چچی سے پڑھیں۔ اور پھر فارسی کی کچھ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے گھر پر مولوی احمد زماں صاحب سے حاصل کی اور بعد میں صابر علی صاحب شاکر سے استفادہ کیا۔ اور در حقیقت شاعری کا ذوق ابتداءً آپ کو شاکر صاحب کے تلمذ کی بدولت، پیدا ہوا۔

حافظ محمود خاں شیرانی ۱۹۱۴ء میں جب انگلستان سے ٹونک واپس آئے تو انہوں نے آپ کی ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی جسمانی تربیت کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ٹونک میں ایک پہلوان قیوم خاں کو آپ کو ورزش کرانے اور کشتی سکھلانے کے لئے ملازم رکھا اور آپ کی فارسی اور خوشنویسی کی تعلیم کے لئے ایک علیحدہ استاد مقرر کیا۔

۱۹۲۰ء کے بعد آپ کے والد ٹونک سے جلا وطنی کے سلسلے میں لاہور چلے آئے۔ اور یہاں آ کر انہوں نے اختر کو اپنے محترم استاد مولوی محمد دین مختار

پروفیسر فارسی اورینٹل کالج لاہور کی خدمت میں پیش کیا۔

اختر نے اورینٹل کالج میں داخل ہو کر اپنی خداداد ذہانت کے وہ جوہر دکھلائے کہ آپ کے اساتذہ ششدر و حیراں تھے۔ وہاں آپ نے غالباً ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ نمبروں میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ لیکن اس کے بعد آپ کے ادبی رجحانات اور ماحول نے آپ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ دیا۔

آپ کا میلان طبع اب پوری قوت کے ساتھ آپ کو شاعری کے میدان میں لے آیا۔ یہاں آپ نے ابتداءً علامہ تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لی اور بعد میں اپنی طبع خداداد ہی کو اپنا استاد بنا لیا۔

پہلے کچھ مدت تک آپ نے رسالۂ ’ہمایوں‘ کی ادارت کا کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں ’انتخاب‘ کی ادارت کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں ’خیالستان‘ نکالا جو بعد میں بند ہو گیا اور اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں چند رسالوں کے لئے ’رومان‘ جاری کیا۔ اور پھر کچھ مدت کے لئے شاہکار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

ان رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین، مطلع السعدین اور جامع اللغات کی ترتیب و تدوین میں بڑا حصہ لیا۔ اور عوفی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔

علاوہ ازیں آپ نے اپنی متعدد کتابیں مثلاً نثر میں ضحاک، آئینہ خانے میں، اور دھڑکتے دل۔ اور نظم میں پھولوں کے گیت، نغمۂ حرم، صبح بہار، اختر ستان، لالۂ طور، طیور آوارہ، شہناز اور شہرود لطوریہ یادگار چھوڑیں۔

۱۹۲۵ء میں اختر کو دار الترجمہ حیدر آباد میں ایک معزز عہدہ پیش کیا گیا۔ لیکن آپ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اختر ایک بے نیاز اور آزاد منش انسان تھے اور نہ وہ کسی قسم کی پابندی اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی طرح جب ان کے والد اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں تشریف لے گئے تو آپ سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔

۱۹۲۶ء میں اختر کی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ اور چونکہ وہ شاعر شباب و رومان تھے اس لئے یہاں کالجوں کی دنیا میں خصوصیت سے آپ کے نام کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

فلیمنگ روڈ لاہور پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ آپ کے لیئے مخصوص تھا۔ جس میں کچھ کتابیں، ایک میز، چند کرسیاں اور ایک چارپائی دیکھی جاتی تھی۔ یہ مختصر سا کمرہ درحقیقت ایک بہت بڑا خزانہ شعر و ادب تھا جہاں اختر نے دنیائے ادب و انشاء میں ایک

طرز اور اسلوب کی بنیاد رکھی، اور جہاں بیٹھ کر اُس وقت کے بیشمار ادیبوں نے آپ سے مذاکرات کے سلسلے میں بے شمار ادبی مسائل حل کئے اور فن شعر کے ہزاروں اسالیب سیکھے ۔ ـــ ـــ پس آج جو اس ـــ گلشن علم و ادب میں یہ بہار تازہ آ رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں اس "اختر ستان" کے فیض و کرم کا بہت بڑا حصہ ہے ۔

۱۹۴۷ء تک لاہور کے فلیمنگ روڈ کے ایک گوشے میں یہ سلسلۂ فیض جاری رہا ـــــ تاآنکہ اختر اس کے بعد اپنے والد کے ساتھ ٹونک تشریف لے گئے۔ وہاں وہ کئی سال تک رہے اور پھر مرنے سے تقریباً چھ ماہ پہلے لاہور آ کر میرے غربت کدہ پہ مقیم ہوئے اور بالآخر ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے محبوب شہر سلمیٰ "لاہور" میں دفن ہوئے ؎

آخر گل اپنی صرف درِ میکدہ ہوئی ‌ ‌ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اختر نے اپنے بعد ایک بیوی، ایک یتیم بچی، دو یتیم بچے اور چالیس دن کی ایک بیوہ لڑکی کو چھوڑا ۔ اس غریب الدیار شاعر کے خاندان کا یہ قافلہ اس کے آخری ایام حیات میں ٹونک سے چلا اور اب بسلسلۂ مہاجرت اس کی والدہ سمیت لاڑکانہ (سندھ) میں مقیم ہے ۔

یہاں اختر کی داستان زندگی سے متعلق یہ چند باتیں ہم نے ضمناً عرض کی ہیں۔ تفصیل کے ساتھ ہم یہ سب کچھ اس کتاب میں ذکر کریں گے جو

ہم آپ کی تاریخ حیات مُرتب کر کے ملک میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تو ہم صرف ان حالات اور حوادث کو بیان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو سلمیٰ کے عشق اور اختر کی رومانی زندگی میں اختر کی نظموں کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں ——— جنھوں نے کائناتِ حُسن و عشق میں آگ لگائی ہے —— —— اک ایسی آگ جس نے خود اختر کو بھی جلا ڈالا۔ چنانچہ اب آپ اسی موضوع کی تفصیلات اگلے ابواب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

۲

اُس شوخ نے لکھا ہے ہمیں پہلی بار خط
جس پر فدا ہزار نہیں سو ہزار خط

پھول ہیں کہ پھول سے عارض کا عکس ہیں
یکسر بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط

حیران ہوں کہ ان میں کروں کس پہ میں یقیں
یہ بے حجاب طرز، یہ بیگانہ وار خط

ہر لفظ میں چھپی ہیں ہزاروں نزاکتیں
کس نازنیں کے عشق کا ہے پردہ دار خط

اختر کے عشق کی ابتداء سلمیٰ کے ایک مکتوبِ محبت سے ہوئی جو انہوں نے اُن کے 'خیالستان' میں ان کی اُس تصویر سے متاثر ہو کر لکھا تھا جس میں اختر فکرِ شعر میں ایک عجیب عالمِ محویت میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔

یہ نامۂ محبت شمامہ کچھ ایسے حسین الفاظ اور دل نشین انداز میں لکھا گیا تھا کہ اس کا ہر ایک فقرہ ایک دردادر بہار و کیف کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا شعر محسوس ہوتا تھا۔

اختر کو اپنی عمر میں پہلی بار اس طرز کا نامۂ شوق ملا تھا۔ جو اُن کے دل و دماغ پر صاعقۂ ہوش و حواس بن کر گرا۔ اور یہ درحقیقت ان کے لئے صنم خانۂ عشق میں ناقوس محبت کی پہلی صدا تھی جو انہیں ہمیشہ کے لئے تڑپا گئی۔

وہ درحقیقت اس خط کو پڑھ کر دیوانہ ہو گئے۔ اور جوانی کی شادلب نزہتوں اور لطافتوں میں غرق ہو کر۔ کچھ ایسا محسوس کرنے لگے کہ وہ اب ایک نئی دنیا میں آ گئے ہیں ——— ایک ایسی دنیا میں جو لذتوں اور مسرتوں سے معمور ہے۔ چنانچہ اسی عالم کیف و سرور میں انہوں نے سلمیٰ سے اپنے عشق کی وہ پہلی یادگار غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے کہ ؎

لے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں   اللہ، ہم کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

اور اب صورت یہ تھی کہ اس وقت جب کہ اختر کے نام سلمیٰ نے اپنا یہ سب سے پہلا مکتوب ارسال کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قصداً اپنا مکمل پتہ نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ اختر اسے بار بار پڑھتے اور حیرت سے سوچتے تھے کہ اس مکتوب میں کسی ذرہ اور آستانہ کا نام و نشان تو متعین نہیں پھر میں اپنی جبین نیاز کو جھکاؤں تو کہاں جھکاؤں۔ چنانچہ اس تاثر کو آپ اپنی اس غزل کے دوسرے شعر میں یوں

ادا کرتے ہیں کہ ؎

در ہے نہ آستاں نہ حرم ہے نہ بتکدہ
یارب مچل پڑی ہے ہماری جبیں کہاں

پھر آگے چل کر اس غزل کے تیسرے شعر میں آپ اس حسین مکتوب کو سورج کی سب سے پہلی کرن سے تشبیہہ دے کر "دل پر نگاہ کریم" کی تاثیر کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

سورج کی سب سے پہلی کرن خوشنما سہی
لیکن تری نظر کی طرح دل نشیں کہاں

اور نتیجہ اب اس کا یہ تھا کہ اپنے محبوب لامکاں کے عرش کا پتہ معلوم ہونے کے باوجود ایک دیوانگی تھی جو اختر کو اس کی تلاش میں کشاں کشاں لئے پھرتی تھی۔ اور وہ کچھ ایسا محسوس کرتے تھے۔ کہ ؎

دامن کش نظر ہے کسی کا حریم ناز
دنیا میں آگئی ہے بہشت بریں کہاں

چنانچہ اب ہمارا شاعر بادۂ عشق سے سرشار ایک نامعلوم محبوب کی جستجو میں دن رات اس عروس البلاد کے ہر کوچۂ و برزن میں اس کی خاک کے ہر ذرے پر اپنی جبین شوق کے سجدے لٹاتا پھرتا تھا۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے۔ کہ

آنکھوں نے ذرے ذرے پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا میرا پردہ نشیں کہاں

اور اس اثنا میں جب کہ وہ شہر جاناں کے گلی کوچوں میں دیوانہ وار چکر لگایا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس مست لم یزلی کا گزر اس فقیر راہ کی طرف بھی ہو جاتا کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ہاں تو اس خط میں اگرچہ پورا پتہ درج نہ تھا۔ لیکن مُہرِ ڈاکخانہ سے اختر کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آفتاب اسی بستی کے کسی گوشہ سے طلوع ہوا ہے اور سلمٰی جن کا اصل نام کچھ اور ہے اور جو سرزمین عشق گجرات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت واقعی اسی بہشت ارضی "لاہور" میں مقیم تھیں ——— اسی لاہور میں جس میں غزنوی کی محبوبیتیں دفن اور زیب النساء کی شعریت اور حسن کی بہاروں کے خزانے مخفی ہیں۔ جہاں انارکلی کی حیات عاشقہ کی آخری ہچکیوں کی یادگار موجود ہے جہاں وہ نور جہاں کی دوسری بہشت برپا آباد ہے جو راوی کی نوربانی اور بہارپوش وادیوں میں جان دے کر حاصل کی گئی کہ ؎

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم   جاں دادہ ایم و جنّتِ دیگر خریدہ ایم

اور جہاں آج بھی راوی کی وادی کی پریاں بتانِ چگل و بربرِ جھرگان شیراز کا حسین ترین جواب ہیں۔

۳
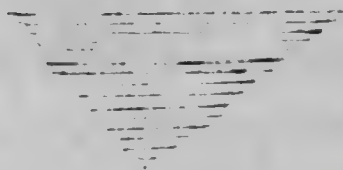
اے نسیمِ سحر آرامگہِ یار کجاست!
منزلِ آں مہِ عاشق کشِ عیار کجاست
شب تاریست و رہِ وادیِ ایمن در پیش
آتشِ طور کجا، وعدۂ دیدار کجاست
بادہ و مطرب و گل جملہ مہیاست ولے!
عیش بے دوست مہیا نشود یار کجاست
باز پرسید ز گیسوئے شکن بر شکنش!!!
کیں دلِ غمزدہ اش گشتہ گرفتار کجاست

اب اختر ایک غیر مرئی چیز کا عاشق تھا۔ جو اس کی رگِ جاں سے قریب تر تھی۔ وہ نادیدہ کچھ ایسی شے تھی جو اس کے رگ و پے میں روح کی طرح سرایت کر چکی تھی اور اس کے دل و دماغ پر شراب کی طرح چھا چکی تھی۔

اس نے اب تک صرف ایک معطر اور رنگین کاغذ دیکھا تھا۔ جس پر

کسی کی نازک انگلیوں نے کچھ نقوش ثبت کئے تھے۔ لیکن وہ کچھ ایسے نقوش سلیمانی تھے جو اُس پر سحر حلال بن کر اثر انداز ہوئے تھے۔

وہ بار بار یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک حسینۂ نازنین کی شبرنگ اور عنبر بار زلفیں اس کی بلائیں لینے کو بڑھ رہی ہیں۔ ایک نقرئی آواز جگہ جگہ اس کا استقبال کر رہی ہے۔ اور صنم کدۂ ہستی کا ایک حسین ترین مجسمۂ حسن و جمال یعنی فطرت کی صنّاعیوں کے کمالات کا ایک آخری مظہر اُسے دعوتِ لطف دے رہا ہے۔

اور جب اس پر اس طرح تصور کی رنگیں وادیوں میں جلووں کی بے پناہ بارش ہو رہی تھی۔ تو کبھی کبھی وہ کثرت انوار و تجلّیات سے حیراں ہو کر بے اختیار یوں پکار اٹھتا تھا۔ کہ ؎

کیا اے حیرتِ نظّارہ آخر تو نے شرمندہ
شکایت کر رہے ہیں جلوہ ہائے رائگاں ہم سے

وہ غیب سے ایک آواز سن رہا تھا جو اُسے بلا رہی تھی وہ وادیٔ عشق میں ایک روشنی دیکھ رہا تھا جو لہرا لہرا کر اس کی طرف لپک رہی تھی۔ اور وہ عالم تصور و وجدان میں وہ مست آنکھوں کا نظارہ کر رہا تھا جو اس شرابی کو شراب پلا رہی تھیں۔

شاعر کا مشغلۂ حیات اب یہ تھا کہ وہ نامۂ محبوب کو سینے سے لگائے دن بھر اس کی تلاش میں اپنے خیالوں میں مست۔ دنیا اور دنیا والوں کے طعنہائے رسوائی سے بے نیاز شہر کے ہر کوچہ و برزن کی خاک چھانتا تھا۔ —— وہ شہر جاناں میں در جاناں پر جبیں سائی کے لئے ہر سنگِ آستاں پر جھکتا۔ اور ہر در و بام کو حیرت اور حسرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا۔ کہ ع

یارب آں شمع دل افروز کاشانۂ کیست

پھر جب شام ہوتی تو وہ "قاشِ فروشِ دلِ صد پارۂ خویش" حسن آباد لاہور کی اُن شاہراہوں پر نکل آتا تھا۔ جہاں ہر ایک گام پر بہ ہی خانۂ خراماں نظر آتے تھے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور کبھی کبھی بے تاب ہو کر یوں پکارتا تھا۔ کہ ؎

نیست در شہر نگارے کہ دلِ ما ببرد

پھر وہ بستی کی گلیوں میں جاتا اور وہاں وہ شام کی تاریکی میں جگہ جگہ کھویا ہوا اور آوارہ سا پھرتا تھا۔ وہاں وہ ہر بھٹکتے ہوئے دوپٹے اور ہر لٹکتے ہوئے دامن سے دل ہی دل میں اپنی سلمیٰ کا پتہ پوچھتا تھا۔

پھر وہ اپنے محبوب چمن کدہ میں جاتا اور عالمِ کیف و سرور میں مستوں کی طرح جھومتا اور دیوانوں کی طرح رقص کرتا تھا۔ کہ اس کے حسین تصورات کی دنیا اس وقت یہ تھی ؎

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقصے چنیں "میان گلستانم" آرزو ست

وہاں وہ اس چمن کے ہر پھول کو سونگھتا اور تماشا یہ تھا کہ جس پھول کو سونگھتا اس سے اسے بوئے نگار آتی تھی۔ یعنی ؎

ستم ظریفیٔ فطرت یہ کیا تماشا ہے | کہ جس کلی کو بھی سونگھو یہیں لگے یار آئے

لیکن کچھ دیر کے بعد جب وہ غور کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ یہ وہ بہار نہیں جس کی اسے تلاش ہے۔ اور یہ وہ پھول نہیں جسے وہ ڈھونڈ رہا ہے یعنی ؎

رنگ بہار یاسمن و گل حسیں سہی | لیکن وہ یاسمن رخ و گل پیرہن کہاں
یہ سچ کہ ہے بہار چمن جانفزا مگر | جس کی تلاش ہے وہ بہار چمن کہاں

اس طرح وہ رات بھر باغ لارنس میں پھولوں سے کھیلتا تھا اور جب وہ اس کھیل سے فارغ ہو کر شہر کے پُر رونق اور آباد حصّوں کی طرف نکل آتا تو وہاں وہ زمین کے تاروں کی اس رنگین دنیا میں ہر جگہ اپنی زہرہ کو ڈھونڈتا تھا۔

اور جب وہ رات کی تاریکیوں میں اس عشرت آباد ہستی کے مختلف گوشوں سے نائے و نوش کی صدائیں سنتا تو کبھی کبھی یوں غزل سرا ہوتا تھا کہ ؎

ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم ... وللعاشق المھجور ما یتجرع[1]

غرض وادیٔ عشق کا وہ نووارد مسافر رات بھر منزل لیلیٰ کی تلاش میں پھرتا اور جب چلتا چلتا تھک جاتا، اور نشان راہ نہ پاتا تو کبھی کبھی تھک کر یوں گنگنانے لگتا تھا۔ کہ ؎

کارم بدندر چرخ نیاں نمے رسد ... خوں شد دلم بدرد و بدرماں نمے رسد

اس کے بعد وہ صحن چمن میں کسی درخت کے سہارے ٹیک کر بیٹھ جاتا اور اپنی شیریں کی یاد میں ہجر کی پہاڑ سی رات آنکھوں میں کاٹ دیتا تھا پھر جب فراق کی اندھیری رات ختم ہو جاتی۔ سپیدۂ صبح نمودار ہوتا؛ اور نسیم سحر اٹھلاتی ہوئی چمن میں آتی تو وہ اس کے ہر ایک مست جھونکے سے یوں مخاطب ہوتا تھا۔ کہ ؎

اے صبا نکہتے از خاک در یار بیار ... ببر اندوہ دل و مژدۂ دلدار بیار

نکتۂ روح فزا از دہن یار بگوئے ... نامۂ خوشخبر از عالم اسرار بیار

یا ـــــ پھر وہ اپنی پیاری اور میٹھی زبان میں یوں نغمہ سرا ہوتا تھا کہ ؎

دلِ مہجور کو تسکین کا ساماں نہ ملا ... شہرِ جاناں میں کہیں مسکنِ جاناں نہ ملا

---

[1] ارباب نعمت کو ان کی نعمتیں مبارک۔ عاشق مہجور کے لئے تو زخم کے گھونٹ ہی ہیں۔

کوچہ گردی میں کئیں شوق کی کتنی راتیں — پھر بھی اس شمع تمنا کا شبستاں نہ ملا
پوچھتے منزلِ سلمیٰ کی خبر ہم جس سے — وادیٔ نجد میں ایسا کوئی انساں نہ ملا
یوں تو ہر راہگذر پر تھے ستارے رقصاں — جس کی حسرت تھی مگر وہ مہِ تاباں نہ ملا
لالہ و گل تھے بہت عام چمن میں لیکن — ڈھونڈتے تھے جسے وہ سروِ خراماں نہ ملا
جس کے پردوں سے جھلکتی ہو نہی نکہتِ شوق — بیخودی کی قسم ایسا کوئی ایواں نہ ملا!
یوں تو ہر در پہ لٹکتے نظر آئے دامن — کھینچے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا
کس کے در پر نہ کیے سجدے نگاہوں نے مگر — ہائے تقدیر وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا
کون سے بام کو رہ رہ کے نہ دیکھا لیکن — نگہِ شوق کو وہ ماہِ خراماں نہ ملا
درِ جاناں پہ فدا کرتے دل و جاں اختؔر — وائے برحالِ دل و جاں درِ جاناں نہ ملا

غرض اسی طرح بہت سی راتیں بسر ہو چکی تھیں۔ اور اب مہینے گذر چکے تھے کہ سلمیٰ کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ یعنی ؎

دیر ست کہ دلدار پیامے نفر ستاد — ننوشت کلامے و سلامے نفر ستاد

بالآخر شب انتظار ختم ہوئی اور صبحِ امید جو مستکف بردۂ غیب تھی باہزاراں آب و تاب جلوہ آرا ہوئی ؎

شب قدر ست و طے شد نامۂ ہجر — سلامٌ ھی حتیٰ مطلع الفجر[۱]

---

[۱] ترجمہ طلوعِ صبح تک سب سلامتی ہے۔ منہ

حسن کو عشق کی بے بسی اور بے چارگی پر اب رحم آگیا۔ یعنی سلمیٰ نے بار دگر اختر کو اپنے نامۂ محبت سے نوازا ــــ کہ وہ اب خود بھی اس کی حسین نظموں کے پردوں میں اس کے دردناک نالے سن سن کر سراپا درد بن چکی تھی۔

یہ خط ایک رنگین اور عطر بیز لفافے میں مستور تھا۔ ایک معصوم اور ننھا قاصد اس کو لایا تھا۔ اور اس میں پروانے کے عشق میں شمع کی ایک یادگار کہانی بیان کی گئی تھی جو بالآخر شمع کے جل جل کر فنا ہو جانے پر ختم ہوئی ــــ آہ

بر لوح تربت پروانہ ایں رقم دیدم
کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت

اس مرتبہ اس نامۂ محبت شمامہ میں منزل جاناں کا پورا پتہ زینت سر قرطاس تھا ــــ آہ وہ منزل جاناں اور وہ ــــ
ــــ حریم ناز جس میں ایک شمع بے پروانہ جل رہی تھی۔ جس کی خاک پر عصمت و عفت کے فرشتے سجدے کر رہے تھے۔ جس میں پروردگار محبت کا تخت حسن و جمال آراستہ تھا ــــ
ــــ جس کا زینہ عشق کی معراج تھا۔ اور جس کی دیواریں بہشت کی دیواریں۔ جن کے نیچے آگے چل کر ہمارا شاعر راتوں کی تاریکیوں میں آنسوؤں کی نہریں بہاتا رہا ہے ــــ

چشمِ حافظ زیرِ بامِ قصرِ آں حوری بہشت
شیوۂ جنات تجری تحتہا الانہار داشت

۴

بنویس دلا بیار کاغذ!
بفرست بآں نگار کاغذ
اے بادِ صبا ببر باں شوخ
از عاشقِ دل فگار کاغذ
تا نامِ تو نقش شد بروماند
بر صفحۂ روزگار کاغذ!

اس نامۂ جاں نواز کے بعد اختر نے اس جانِ آرزو[1]۔ ایمانِ آرزو یا آرزوئے جاں کی خدمت میں اپنے دلِ ہجراں نصیب کی طرف سے وہ

---

[1] اختر ایک جگہ کہتے ہیں :-

میں آرزو کے جاں لکھوں یا جانِ آرزو | تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو
ایمان و جاں نثار تری اک نگاہ پر | تو جانِ آرزو ہے تو ایمانِ آرزو

تعلیقۂ نیاز عرض کیا جس میں ہجر و فراق کی حشر خیزیوں کی پوری کہانی بیان کی گئی تھی ؎

از خونِ دل نوشتم نزدیک دوست نامہ   اِنّی رایت دھراً من ھجرک القیامہ[1]

یہ خط در حقیقت سلمیٰ کے حریم ناز میں اس عبادت گزار کعبۂ محبت کی طرف سے اذانِ عشق کی پہلی گونج تھی ——— اس میں اس نے اپنی آنکھوں کی تمنائیں اور دل کی آرزوئیں حرفوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی ؎

سوادِ دیدہ حل کردم نوشتم نامہ سوئے تو
کہ تا ہنگامِ خواندن یک نظر افتد بہ روئے تو

اور اس طرب نامۂ محبت کے بعد وہ شہرستانِ ہستی میں اپنے مسجودِ افکار کی عبودیت کا نعرۂ مستانہ لگا کر سلمیٰ اور صرف سلمیٰ کا ہو چکا تھا۔ اور اس کے ماسوا اس نے دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ لیا تھا۔ یعنی ؎

حافظ آں روز طربنامۂ عشق تو نوشت   کہ قلم بر سرِ اسبابِ دلِ خرم زد

اب یہاں سے عاشق و معشوق کی خط و کتابت کا ایک لا متناہی سا

---

[1] ترجمہ۔ بیشک میں نے تیرے ہجر میں زمانے کو قیامت کی شکل میں دیکھا۔ منہ

سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جب اس بادشاہ کشور حسن کا خط آتا تو یہ غریب دشت صحرائے عشق اُسے سر نہتا۔ بار بار آنکھوں سے لگاتا۔ اور کچھ یوں محسوس کرتا تھا۔ کہ ؎

چہ لطف بود کہ ناگاہ رشحۂ قلمت حقوقِ خدمت ما عرض کرد بر کرمت
بنوک خامہ رقم کردہ سلام مرا کہ کار خانۂ دوراں مباد بے رقمت
مگو یم از من بیدل بہ سہو کردی یاد کہ در حساب خرد نیست سہو بر قلمت

اکثر اپنے کلبۂ احزاں میں وہ اپنے ننھے قاصد کے انتظار میں در وا اور دیدۂ و دل فرش راہ کئے بیٹھا رہتا اور جب وہ پیک نامور پہنچتا تو اس سے خط لیکر بار بار پڑھتا اور پھر اس کی معصومانہ زبان میں اس سے یا را اور کوئے یار کی باتیں سنتا اور فرط مسرت و انبساط سے جھومتا تھا۔ کہ ؎

آں پیک نامور کہ رسید از دیارِ دوست
آورد حرزِ جاں زخطِ مشکبار دوست
خوش مے دہد نشانِ جلال و جمالِ یار
خوش مے کند حکایت عز و وقارِ دوست

اور اس اثناء میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ ستم ظریف نامہ بر کچھ مدت کے لئے غائب ہو جاتا۔ اور اس وقت ہمارا شاعر بڑی بے چینی کے ساتھ اُسے بار بار یاد کرتا تھا۔ کہ ؎

قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا	چہ شود گر بسلامے دلِ ما شاد کند

اور پھر وہ حزن و فکر کے عمیق بحر میں غرق ہو جاتا تھا۔ کہ ؎

حسب حالے نہ نوشتیم و شد ایامے چند	قاصدے کو کہ فرستم بتو پیغامے چند

اور جب وہ درد و کرب انتظار سے ایک مدت تک بے قرار رہتا تو کبھی کبھی یوں گنگناتا تھا۔ کہ ؎

آں خالیہ مُو گر سوئے ما نامہ نوشتے	گردوں ورقِ ہستیٔ ما در نوشتے

اس اثنا میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سلمیٰ کچھ مدت کے لئے لاہور سے باہر شاید گجرات چلی گئیں اور دیر تک کوئی خط نہ آیا یعنی اب صورت یہ تھی کہ ؎

مدتے شد کہ رہ و رسم ودادے بست	نہ کسے مے رود آنجا نہ کسے مے آید

نامۂ یار کو آنکھوں سے لگائے اب مہینے ہو گئے تھے۔ اور ہجر کا ایک ایک دن ایک ایک برس ہو کر گزر رہا تھا۔ کہ ؎

ماہم ایں ہفتہ شد از شہر و بچشم سالیست

حال ہجراں تو چہ دانی کہ چہ مشکل حالیست

اس اثنا میں وہ بارہا شہر کے اس حصہ کی طرف جو جہان خراب میں ایک ہی آباد گوشہ تھا جاتا۔ اور وہاں خاک کے ہر ذرہ سے پوچھتا کہ سلمیٰ کا قافلۂ بہار کہاں چلا گیا ؎

مالسلمیٰ ومن بذی سلم　　این جیراننا کیف الحال[1]

اور جب وہ کسی طرف سے کوئی جواب نہ پاتا تو عالم اضطرار میں یوں دعائیں مانگتا تھا۔ کہ ؎

یا رب آں آہوئے مشکیں بختن باز رساں
واں سہی سرو رواں را بچمن باز رساں
دل آزردۂ ما را بہ نسیمے بنواز!!!
یعنی آں جاں ز تن رفتہ بہ تن باز رساں
ماہ و خورشید بہ امر تو بہ منزل چو رسند
یار مہ روئے مرا نیز بمن باز رساں!

دل میں طرح طرح کے خیالات موجزن رہتے اور اکثر سوچتا تھا کہ ؎

دیر ست کہ دلدار پیامے نفرستاد　　ننوشت کلامے و سلامے نفرستاد
صد نامہ فرستادم و آں شاہ سواراں　　پیکے ندوانید و پیامے نفرستاد
سوئے من وحشی صفت عقل رمیدہ　　آہو روشے کبک خرامے نفرستاد
فریاد کہ آں ساقی شکر لب سرمست　　دانست کہ مخمورم و جامے نفرستاد

---

[1] حافظ کا شعر ہے۔ ترجمہ۔ سلمیٰ کیسی اور ذی سلم (قبیلہ) کس حال میں ہے ہمارے پڑوسی کیسے ہیں ان کا کیا حال ہے۔ منہ

چندانکہ زدم لافِ کراماتِ مقامات — ہیچم خبرے نیست، مقامے نفرستاد
حافظ بہ ادب باش کہ در خواستِ شکستہ — گر شاہ پیامے بہ غلامے نفرستاد

یا پھر وہ اپنی شاعری کی زبان میں یوں غزل سرا ہوتا تھا کہ ؎

ہوا زمانہ کہ اس نے ہم کو نہ بھول کر بھی سلام بھیجا
مزاج پوچھا نہ حال لکھا، نہ خط نہ کوئی پیام بھیجا
نگاہ اختر نے کہہ دیا کیا کہ جا چھپا ساقئ دلآرا
نہ بادۂ مشکبو عطا کی، نہ ساغرِ لالہ فام بھیجا

بالآخر سالہا سال کی محرومی کے بعد ایک دن وہ بھولی ہوئی خوشبو آگئی اور اس وقت ہمارا شاعر عالم بادۂ و نغمہ میں جھوم جھوم کر یوں نغمہ پیرا ہوا کہ ؎

پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی — محرمِ گیسوئے جانانہ کدھر سے آئی
سالہا سال کی محرومی و تنہائی کے بعد — یہ انیسِ دلِ دیوانہ کدھر سے آئی
آہ وہ نکہتِ مدہوش جو کھو دیتی تھی ہوش — پھر جلو میں لئے مے خانہ کدھر سے آئی
ایک دن جس سے مہکتا تھا حریمِ سلمیٰ — وہی خوشبوئے دل دیوانہ کدھر سے آئی
ایک بھولا ہوا خواب ایک بھلائی ہوئی یاد — لے کے یہ مونسِ جانانہ کدھر سے آئی
اُس کے پیراہنِ رنگیں میں جو بستی تھی مہک — پھر بناتی ہوئی دیوانہ کدھر سے آئی
چپکے چپکے جسے سنتی تھی شبِ وصل نسیم — گنگناتی وہی افسانہ کدھر سے آئی

جس کی مستی میں ہیں گم ارض و سما نکہت و شمیم — پھر لٹاتی ہوئی میخانہ کدھر سے آئی

جس کی ہر لہر میں ہے حسنِ غزلخوانیِ نسیم — آج یوں جانبِ کاشانہ کدھر سے آئی

جس کی ہر موج میں فردوس سے رقصاں ہوا — پھر لنڈھاتی ہوئی خمخانہ کدھر سے آئی

جس کے قدموں پہ پری خانۂ انجم ہو نثار — وہ پری، جانِ پریخانہ کدھر سے آئی

جس کو احساس کے ہونٹوں سے پیا کرتے تھے — خود اٹھائے وہی پیمانہ کدھر سے آئی

رہ گذارِ دل پہ ہوا کی تھی جس کی حسرت — گھر پہ وہ نکہتِ شاہانہ کدھر سے آئی

لیکے گیسوئے سلمیٰ کا پیامِ رنگیں — آج یہ قاصدِ جانانہ کدھر سے آئی

ہاں تو ایک زمانۂ دراز تک یہ رسمِ کتابت جاری رہی تاآنکہ اختر و سلمیٰ کے خطوں کا ایک ضخیم مجموعہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو گیا جس میں بالترتیب یکے بعد دیگرے ان دونوں سرگشتگانِ وادیِ عشق کے نامہ ہائے محبت درج تھے —— یہ مجموعہ متعدد دوستوں کے پاس رہا۔ اور اس سلسلے میں مجھے بھی مطالعہ کے لئے عنایت کیا گیا۔ لیکن بعد ازاں مجھ سے لے لیا گیا۔ اور جیسا کہ ایک مرتبہ اختر نے خود مجھ سے ذکر کیا۔ آخر میں یہ گلدستۂ مکاتیب آپ نے محترمہ سلمیٰ کی فرمائش پر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اس حسین مجموعۂ مکاتیب میں اختر نے نثر میں جس رومانی شاعری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ ملک کے سامنے آجاتی تو دنیا دیکھتی کہ یہ نثر رنگین طرب خانۂ ادبیات اردو میں پیر مغاں کی لازوال بخشش کی ایک ایسی نشانی ہے جس کا ہر لفظ بط شراب اور ہر فقرہ مکمل سفینۂ غزل ہے۔

یہاں مجھے یہ ایک حقیقت بیان کرنے دیجئے کہ دنیا میں جتنے بھی تاجداران اقلیم سخن گزرے ہیں ان میں سے اکثر کو رہ و رسم کتابت کے اس حسین دور سے گزرنا پڑا ہے۔ اور یہی وہ منزل ہے جہاں آکر خود بخود ہر مسافر کی زبان میں شیرینی، کلام میں رنگینی اور بیان میں شوخی، لطافت اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

اور اختر جب اس راہ سے گزرا تو اس شان سے گزرا کہ اس میدان میں بھی اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ یعنی ؎

پہلواں کوئی بھی میدان سخن میں نہ رہا تو نے کیا معرکہ اے داغ سخنور مارا

اختر کی طرح سلمٰی کے خطوط بھی ادب، انشاء، زبان اور رنگینیٔ ادائے مطالب کی حیثیت سے لاجواب تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حسین و جمیل مکاتیب بعض اعتبارات سے اختر کے خطوں پر تفوق رکھتے تھے کیونکہ ان میں اظہار محبت کے لئے نسوانی شرم و حیا کے عنصر کے لطیف امتزاج نے لفظوں میں ایک ایسی رنگینی، شوخی اور دلربائی پیدا کر دی

تھی۔ جو صرف سلمیٰ ہی کی حسین تحریر میں نظر آسکتی ہے ؏

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم نے کسی کی شوخیٔ تقریر کی ترجمانی کا حق کچھ اس طرح ادا کیا ہے ؎

تبسم زیرِ لب، لغزش زباں میں، شرم آنکھوں میں
مزہ آتا ہے جب میرا کبھی وہ نام لیتے ہیں!

سلمیٰ ایک بہت بلند پایہ ادیبہ ہیں اور افسوس ہے کہ سماج نے مواقع پیدا نہیں ہونے دیے ورنہ شاید دنیا کو اختر کے علاوہ ایک آفتابِ شعر و ادب میسر آسکتا —— ایک ایسا آفتاب جس کے عکسِ جمیل سے اختر جیسی رد کشِ ماہ نیم ماہ شخصیت تاباں ہوئی۔

ہاں تو اس انشائے اختر و سلمیٰ میں اختر سے زیادہ سلمیٰ کے ادبی مذاق کی عظمت نمایاں تھی۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا سرسری اندازہ کیجئے۔

ایک بار جب سلمیٰ کو محسوس ہوا کہ میرا شاعر عالمِ کیف و مستی میں بہک کر اپنی بہکتی ہوئی تحریروں میں کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے۔ تو اس نے اختر کو ایک عجیب و لطیف کنایہ اور شاعرانہ پیرایہ میں یوں تنبیہ کی کہ

ضبط اے عشق اس افسانے کو قولِ عام نہ کر

اور اس کے جواب میں اختر کو لکھا تھا کہ ؎

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر
اس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہیں بدنام نہ کر

غیرتِ حسن کو منظور نہیں رسوائی
ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

ایک مرتبہ اختر نے جب سلمیٰ کی پہلی ملاقات کے بعد اپنا دہ غیر فانی شاہکار جس کا عنوان "ایک بار دیکھا دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے"۔ سلمیٰ کی جناب میں پیش کیا تو اس کے جواب میں سلمیٰ نے جو یہ لاجواب نظم لکھ کر بھیجی حسن و عشق کے افسانوں کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی ؎

کسی کی چشمِ ہوس آشکار کیوں دیکھے
کسی کو یوں کوئی گستاخ وار کیوں دیکھے

دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو
کوئی یہ سرخئ افسانہ کار کیوں دیکھے

ہمارا آئنہ کیوں ہم سے ہمکنار نہ ہو
خدا نہ کردہ تمہیں ہمکنار کیوں دیکھے

ہیں پردہ دار سراپردہ ہائے عفت ہم
شفق بھی ہم کو سر جوئبار کیوں دیکھے

کبھی نہ جائیں گے اب کے چمن میں بھول کے بھی
نگاہِ گل ہمیں آئینہ وار کیوں دیکھے

روپہلی چاندنی اور اس کی اس قدر جرأت
وہ ہم کو سوتے ہوئے بار بار کیوں نہ دیکھے
حیا سے دیکھتے ہی پانی پانی ہو جائیں
ہمیں گھٹا بھی سر آبشار کیوں دیکھے
عروس برق ہے ہم جنس، پر نہیں منظور
وہ غرق مستی ابر بہار کیوں دیکھے
قسم ہے آج سے گر بام پر چڑھیں، سورج
ہمارے گیسوئے مشکیں بہار کیوں دیکھے
نہیں، کہ غیر ہے لیکن ہمارے جلوؤں کو
گروہ گل بھی تہ شاخسار کیوں دیکھے
یہ جرم کم ہے کہ اک بار ہم کو دیکھ لیا
کوئی شریر ہمیں بار بار کیوں دیکھے
لگا دیں لو نہ کہیں بے سبب نگاہوں کو
قلم کو صبر سکھا دو ادب نگاہوں کو

اور ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ جب اختر کے پہلے بچے کا انتقال ہوا تو سلمیٰ نے اس کی تعزیت کے لیے خط لکھا جس میں یہ شعر جو طرۂ عنوان تھا مجھے کبھی نہیں بھولتا ؎

روز جب شام کو گھر لوگ چلے جاتے ہیں
نہیں معلوم ترا ناک تماشا کیا ہے!

اور پھر ایک دن جب سلمیٰ کے گھر کے افراد اس کے ذہنی اضطراب اور گرد و پیش کے حالات کا اندازہ کر کے کچھ سمجھ گئے تو وہ سرِ شام گھبرا کر اپنے مکان کی بالائی منزل پر چلی گئی اور وہاں عالمِ تنہائی میں شفق کی رنگینیوں میں محو ہو کر اپنے خونِ آشامِ عشق کے انجام کو سوچ کر بے چین ہو گئی۔ اس عالمِ یاس و انتظار میں اس نے جو مکتوب اپنے اختر کو لکھا۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوئی تھی کہ ؎

دل خود بخود اداس ہوا جا رہا ہے کیوں
کوئی بلا ہے شامِ غمِ بہار کے آس پاس

اس مجموعۂ مکاتیب میں اختر نے ٹائیٹل کے صفحہ پر سب سے اوپر یہ شعر لکھا تھا۔ کہ ؎

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا!

اور اتفاق ملاحظہ فرمائیے۔ کہ واقعی جب اُن کے مرنے کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی ——— صندوقچی کو جو ان کی کل کائنات ——— اور میراث تھی۔ ان کے عزیزوں کے روبرو لا کر کھولا گیا تو اس میں چند مسودوں

اور حسینوں کے چند خطوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا ـــــــــ

اور ان مسودوں میں سب سے پہلے جو شعر مجھے نظر آیا وہ یہ تھا کہ ؎

بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں اک دن
کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں اک دن

۵

روزِ ہجراں و شبِ فرقتِ یار آخر شد
زدم ایں فال و گزشت اختر و کار آخر شد

آں ہمہ ناز و تنعّم کہ خزاں مے فرمود
عاقبت در قدم باد بہار آخر شد

بعد ازاں نور بآفاق دہیم از دلِ خویش!
کہ بخورشید رسیدیم و غبار آخر شد

آں پریشانیٔ شبہائے دراز و غم دل
ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد

شب امید کہ بُد معتکفِ پردۂ غیب
گو برو ں آئے کہ کار شب تار آخر شد

خط و کتابت کا یہ سلسلہ شبِ ہجر کی طرح دراز ہو چکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ایک خط آتا اور ایک جاتا تھا ——— لیکن اب

ایسا تھا کہ دیدۂ دیدار طلب کچھ اور طلب کرے۔ کہ ؎

آگ سی دل میں لگا جاتا ہے تیرا ہر خط
آ مرے خرمنِ ہستی کو جلا دے آ کر

شاعر نے اب مصر لاہور کی اس حسین قلو پطرہ سے جسے وہ اپنے جنت کدہ تخیل میں پرستان لطافت کی پری اور جہان قدس کے فردوسی افسانے کی ایک حسین ترین حور سمجھتا تھا۔ تصویر کی درخواست کی ——
اور جب اس حورِ بہشت رنگ و بو کی تصویر پہنچی تو وہ اسے اپنے حسنِ خیال سے زیادہ نازک اور حسین پا کر یوں غزل سرا ہوا ؎

تو از سر تا بپا اک نکہت تنویر ہے سلمیٰ

شراب و شعر و موسیقی میں پنہاں تیری نگہت ہے
مرے خاموش دل میں موجزن تیری محبت ہے

بہار اور خواب کا ہیکل تری تصویر ہے سلمیٰ

ادا اس طرح فرض رونمائی کچھ تو کر جاؤں
تری تصویر سینے سے لگاؤں اور مر جاؤں

تصویر کا پہنچنا تھا کہ شاعر کے گھر میں شام بہار آ گئی۔ اس کا شبستان چمک اٹھا۔ تصور کی رنگینیوں نے انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کے سامنے

جلوے مچلنے اور میخانے چھلکنے لگے ع
آنکھوں کے آگے جھومتا میخانہ آگیا

شاعر کی روح کو اب جذبۂ محبت نے موج بیخودی بن کر دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کیا۔ کہ ع
بے روئے دلفریب تو بردن صواب نیست

لہٰذا اب اس نے جرأت کی اور بالآخر دل کی مجبوری کے ہاتھوں تنگ آکر صاف صاف اور بالتفصیل عرض کر دیا۔ کہ

گو تم سے مجھے نسبت نہیں کچھ اور ہے تو گدا و شاہ کی ہے
وہ ذرّہ ہوں جس کے دل میں نہاں امیدِ وصال ماہ کی ہے
اک شاعر مفلس جس کو ہوس اک قیصر روزی جاہ کی ہے
پھر بھی یہ جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

لیکن طالع بیدار کی جوان بختی کے قربان جایئے کہ درخواست کو شرفِ قبولیت بخش دیا گیا۔ روز سیاہ کی قسمت پلٹی اور سرِ شب دعوت نامۂ وصال پہنچ گیا۔ کہ ع
زدر در آ و شبستانِ ما منور کن

شاعر اس کو پڑھ کر فرط مسرت و انبساط سے جھومنے لگا۔ کہ ؎

رونقِ عہدِ شباب ست دِگر بستاں را
می رسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحاں را

اختر نے اس وقت اپنے بے پناہ طوفانِ جذبات سرور و نشاط میں جو کچھ محسوس کیا وہ سب اس نے اپنی ایک خاص نظم میں بیان کر دیا ہے — اور سچ یہ ہے کہ اس وقت کی کیفیت اس سے زیادہ بہتر شکل میں آج تک نہ بیان کی گئی اور نہ بیان کی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو[۱]

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات
کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

کیمل نہ گلزار میں اٹھلاتی پھرے بادِ نسیم

---

[۱] اختر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ بلا جھجک کہہ دیتے ہیں لیکن یہ نظم کچھ ایسی تھی جسے ابتداء میں وہ خاص دوستوں کو دکھلانے میں بھی جھجک محسوس کرتے تھے۔ لیکن بالآخر احباب کا اصرار غالب آیا۔ اور یہ نظم ان سے اشاعت کے لیے حاصل کر لی گئی۔ منہ

کیوں نہ ہر پھول ہو سر سبز بہار تسنیم
کیوں نہ آمادۂ افلاک ہو پروازِ شمیم
کیوں نہ ہر ذرّہ بنے جلوہ گہ طورِ کلیم
کہ انہیں دیکھیں گے ہم جلوہ نما آج کی رات

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں
باغ میں پھول سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں
ایک ہیں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی!!
دُور سے ہم پہ جو دل اپنا فدا کرتی تھی
دادِ اشعار جو گم نام دیا کرتی تھی!!!
ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات

جس کی رنگینی سے افکار ہیں مدہوش مرے
جس کی الفت سے ہیں اشعار پُر از جوش مرے
جس کی فرقت میں خیالات ہیں غم کوش مرے

جس کے جلوؤں سے تصوّر ہیں ہم آغوش مرے
جلوہ دکھلائے گی وہ حورِ لقا آج کی رات

داستانِ دلِ بے تاب سنائیں گے انہیں
آپ رو دیں گے گلے مل کے رُلائیں گے انہیں
خود ہی پھر رونے پہ ہنس دیں گے ہنسائیں گے انہیں
اور جرأت کی تو سینے سے لگائیں گے انہیں
نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات

دل کی رگ رگ میں ہے بیتاب محبت اس کی
آنکھ کے پردے پہ لہراتی ہے صورت اس کی
خلوتِ روح میں آباد ہے الفت اس کی
میرے جذبات پہ طاری ہے لطافت اس کی
اور کچھ یاد نہیں اس کے سوا آج کی رات

نکہتِ حسن ہو داماں ہوا میں رقصاں
جذبۂ عشق ہو رنگین فضا میں رقصاں
کیف و سرمستی ہو منظر کی اداؤں میں رقصاں
نور ہی نور ہو یوں ارض و سما میں رقصاں
کہ خدائی میں اتر آئے خدا آج کی رات

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے ان کو
غمِ الفت سے خبردار کریں گے ان کو
محرمِ جذبۂ اسرار کریں گے ان کو
گود میں لیں گے انہیں پیار کریں گے ان کو
دل کی رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا آج کی رات

لیکن اظہارِ خیالات کریں گے کیونکر
شرم آتی ہے ملاقات کریں گے کیونکر
بات کرنی ہے مگر بات کریں گے کیونکر
ختم یہ خواب کی سی رات کریں گے کیونکر
آہ یہ آج کی یہ خواب نما آج کی رات

اے دل ایسا نہ ہو کچھ بات بنائے نہ بنے
حالِ دل جو بھی سنانا ہے سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو مگر پاس بٹھائے نہ بنے
شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

یوں تو ہر طرح ادب مدِّ نظر رکھنا ہے
حسرتِ دل کا لحاظ آج مگر رکھنا ہے

بے خودی! دیکھ تجھے میری خبر رکھنا ہے
نازنیں قدموں پہ یوں ناز سے سر رکھنا ہے
کہ تڑپ اُٹھے دلِ ارض و سماء آج کی رات

ہم ہیں کچھ جراُتِ گویائی بھی ہوگی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں
شرم سے دُور شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں
یوسفِ دل سے زلیخائی بھی ہوگی کہ نہیں
آج کی رات اُف او میرے خدا آج کی رات

ملاقات کے لیئے نصف شب کا وقت مقرر تھا ــــ خدا خدا کر کے آدھی رات ختم ہوئی اور شاعر نے دیارِ حسن کی طرف شدِ رحال کیا۔

آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ سرما کا موسم تھا اور سردی کا یہ عالم تھا کہ بقولِ انشاء کاسۂ چرخ بریں شدتِ برودت سے جم گیا تھا ــــ لیکن شاعر اپنے غم گسار رفیق کے ساتھ فرطِ مسرت سے ناچتا ہوا منزلِ سلمیٰ کی طرف جا رہا تھا۔

بالآخر وہ منزلِ مقصود پر پہنچا۔ پہلے کچھ دیر قصرِ سلمیٰ کے

نیچے کھڑا رہا اور بجز معراجِ عشق کی بلندی پر فائز ہوا۔ یعنی زینے کا سب سے اوپر کا دروازہ کھلا اور وہ حریم حسن میں داخل ہوا اور اس کا ساتھی کواڑ کے پاس اس زینے کی دیوار کا سہارا لیکر بلا تکلف ایک سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ کہ ؎

ما بدیں در نہ پئے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از پئے حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم

شاعر اب حسن کے قدموں پر جھکا۔ اور خم ابرو کے سایہ میں کچھ اس انداز سے اُس نے سجدۂ عبودیت پیش کیا ——— کہ ع

حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

حسن نے جب یہ موثر منظر دیکھا ——— تو وہ خود بھی تڑپ اُٹھا ——— اس نے اب عشق کی نماز قبول کرلی۔ اور اُسے اپنے قدموں سے اٹھایا اور آنکھوں پر بٹھایا ——— اور اب وہ خود ربُّ الارباب کی جناب میں یوں حمد سرا ہوا ——— کہ ؎

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب
کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب
چو دیدم روئے خوبش سجدہ کردم
بحمد اللہ نکو کردارم امشب

براتِ لیلۃ القدر سے بد ستم
رسید از طالع بیدارم امشب

اس کے بعد کتاب عشق کے ورق اُلٹے گئے۔ محبت کا فسانہ اور رُباب دل کا ترانہ چھیڑا گیا۔ اور دونوں بے تاب دلوں نے خاموش آہوں اور محبت کے آنسوؤں کی زبان میں کچھ اس انداز میں اپنی کہانی بیان کی کہ واقعی دلِ ارض و سما تڑپ اُٹھا ——— تا آنکہ لیلۃ القدر ختم ہوئی۔ مرغِ سحر نے اذان دی اور صبحِ سعادت کا ستارہ چمکا ——— عشق اب پھر بیخود ہو کر سجدہ میں گرا اور حسن نے اس کی عبادت کو شرف اجابت بخش کر اسے تمام دنیا کی نعمتوں اور سعادتوں سے مالا مال کر دیا ——— آہ ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوش دل چہ عجب
مستحق بودم و اینہا بزکاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدہ ایں دولت داد

کہ بازار غمت ہم بسر و شتابتم دادند
این ہمہ قند و شکر کز سخنم مے ریزد
اجر صبر یست کزاں شاخ نباتم دادند
کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں
خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

اور پھر اس کے بعد حسن نے عشق کی طرف حسرت بھری آنکھوں سے دیکھا ــــ اور اُسے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اور اب اس کے بعد وہ آنے کو تو اپنے گھر واپس آگیا ــــ لیکن حالت اب یہ تھی کہ شب و روز آب رواں کی طرح بے چین اور ساز کی صدا کی طرح بے قرار رہتا ــــ آٹھوں پہر وہی ہوشربا جلوے اس کی آنکھوں میں سمائے رہتے جو اس نے حریم جاناں میں دیکھے تھے ــــ اور وہی کیف بار آنکھیں ہر وقت اس کی آنکھوں میں بسی رہتی تھیں جنہوں نے ایک شب شبستان حسن میں پیمانے لنڈھائے تھی ــــ وہ ہر وقت مست و بیہوش رہتا ــــ اور

صبا کے ہر جھونکے سے اسی بوئے زلف عنبریں کے لیئے دست سوال
دراز کرتا جو خلوت گہ یار کو مہکائے ہوئے تھی کہ ؎

صبا اگر گذرت افتد بکشور دوست
بیار نفحہ از گیسوئے معنبر دوست

بالآخر جب تاب انتظار باقی نہ رہی۔ اور دل پر اختیار کا یارا نہ
رہا تو شاعر نے مجبور ہو کر پیام شوق روانہ کر دیا۔ کہ —— ایک بار
دیکھا دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے —— یہ پیام شوق اختر کی ایک
ایسی غیر فانی نظم ہے جو عشق و محبت کے افسانوں میں رہتی دنیا تک
یادگار رہے گی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ——

تمہیں ستار دل نے بے اختیار دیکھا ہے
سر پر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لیئے
تو آئینے نے تمہیں ہمکنار دیکھا ہے

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِجوئبار دیکھا ہے
نسیمِ باغ نے زیب النساء سمجھ کے کبھی!
تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے
دکھا دو ایک جھلک۔ اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور اس کا جواب اگرچہ سلمیٰ نے اپنی ایک نظم[1] میں کچھ اس طرح دیا تھا کہ ؎

کسی کی چشمِ ہوس آشکار کیوں دیکھے
کسی کو یوں کوئی گستاخ وار کیوں دیکھے

لیکن یہ تو سب کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل چیز یہ ہے۔ کہ اُدھر بھی سینے میں عشق کی وہی شمع روشن تھی۔ جو اختر کے گھر میں اُجالا کئے ہوئے تھی۔

[1] یہ پوری نظم ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ منہ

۶

چو باد عزم سرِ کوئے یار خواہم کرد
نفس بہ بوئے خوشش مشکبار خواہم کرد
ہر آبروئے کہ اندوختم ز دانش و دیں
نثارِ خاکِ رہِ آں نگار خواہم کرد
چو شمعِ صبحدمم شد ز مہرِ او روشن
کہ عمر در سرِ ایں کار و بار خواہم کرد

حسن نے عشق کی درخواست کو اب بھی شرفِ قبولیت بخشا۔ لیکن اس مرتبہ چونکہ سلمیٰ گجرات جا رہی تھیں، اس لیئے انہوں نے آخر کو اس بار اس سرزمینِ عشق [illegible] سیر کی دعوت دی اور ملاقات کے لئے گجرات طلب فرمایا ——— اور بالآخر وعدہ کے مطابق دل کے ہاتھوں کشاں کشاں عازمِ گجرات ہوئے۔

خوش قسمتی سے گجرات کی ملاقات کی رات برسات کی رات

اور ایک بڑے پُر کیف، مشکبار اور رومان خیز لمحات کی رات تھی۔
اس رات آسمان پر مست اور گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔
فضا میں بجلیاں رقص کر رہی تھیں۔ اور مشکبو ہوائیں چناب کی اس
گلپوش وادی کو عطر زار نکہت و کیف بنائے ہوئے تھیں۔
شاعر یعنی اپنے وقت کا یہ مہینوال وعدہ کی شب سر شام ہی لاہور
سے گجرات پہنچ چکا تھا۔ اور چونکہ اس مرتبہ بھی اس کی سوہنی نے ملاقات
کے لیے آدھی رات ہی کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس لیے وہ اس
فرصت میں اپنی سوہنی کی ملاقات کی خوشی میں فطرت کی فیاضانہ
بہار آفرینیوں سے پوری طرح مستفیض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔
چنانچہ اس انتخاب ہفت کشور میں غنیمت کے اس سب سے
زیادہ محبوب خطۂ بہار کے ----- کی وادئ رنگ و بو میں یہ
"عزیز خاطر آشفتہ حالاں" اپنے مدشاہد نازک خیالاں" کی یاد میں
مست رود چناب سے لے کر گجرات تک، آدھی رات تک اِدھر
سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دیوانوں کی طرح رقص کناں پھرتا رہا
کبھی وہ چناب کے کنارے پہنچتا اور وہاں کھڑا ہو کر اس کے
طوفانوں کی شور شوں کی صداؤں میں گم ہو جاتا۔ ------- اور
جب ہوش آتا تو وہ عشق و عاشقی کے اُس حسین کھیل کو یاد کرتا جو

مدت ہوئی کبھی اس قلزم سیماب کے ساحل پر کھیلا گیا تھا۔

اس کے بعد وہ عالم کیف و بیخودی میں اپنے عشق کے دل گداز نغمے چھیڑتا اور اس نشہ زار وادی میں کیف و سرور کے خم خانے لنڈھاتا شہر گجرات کی طرف لوٹتا اور وہاں دور سے کھڑا ہو کر دیار سلمیٰ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور سلام شوق پیش کرتا۔۔۔۔۔

پھر وہ شہر کی گلیوں میں داخل ہوتا اور وہاں ہر در و بام پر نگاہوں سے محبت کے سجدے لٹاتا ہوا کوے جاناں میں پہنچ کر سجدہ عبودیت پیش کرتا۔ اور اس کے بعد جوش جنون محبت میں پھر یہی سلسلہ شروع کر دیتا۔

غرض اسی طرح وقت گزرتا گیا۔۔۔۔۔۔ تاآنکہ اس لیلۃ القدر کی وہ ساعت مبارک آ پہنچی جس پر خیر و برکت کی ہزاروں راتیں نثار۔

شب قدر چنیں عزیز و شریف

شاعر اب اسی کوچے میں پھر پہنچا جس کا اسے پہلے سے علم تھا۔ اور اس کے بعد گلی کی ایک سمت سے آہستہ سے ایک دروازہ کھلا۔ اور آواز آئی۔ کہ ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز درد تو در خانۂ ما

شاعر اب حریم ناز میں داخل ہوا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا

اس کا خلاصہ اُسی کی زبان سے یوں سنیئے۔ کہ ؎

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
آہ یہ زلف ہے یا ابر سر میخانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جام شراب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے سرزنش بہ حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ
حسرت بوسہ بہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگ گلاب آلودہ

اس کے بعد یہ پُربہار رات ختم ہوئی۔ شاعر لاہور واپس آیا۔ اور یہاں آکر چند روز کے بعد اس نے گجرات کی اس برسات کی رات کی یاد میں وہ رُوح پرور نغمہ گایا جس سے زیادہ جاں نواز نغمہ آج

تک بربط عشق پر نہیں چھیڑ آگیا۔ کہ ؎

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات
کیا گزر جائے گا رہ جا یہیں رات کی رات

ان کی پابوسی کو جائے تو صبا کہہ دینا
آج تک یاد ہے وہ آپ کے گجرات کی رات

جس میں سلمیٰ کے تصور سے کیے ہیں تارے روشن
میری آنکھوں میں ہے وہ عالم جذبات کی رات

ہائے وہ مست گھٹا ہائے وہ سلمیٰ کی ادا
آہ وہ ردِ حجاب آہ وہ گجرات کی رات

میرے سینے پہ ادھر زلف معطر کا ہجوم
(آہ وہ زلف کہ آوارہ خرابات کی رات)

سطح دریا پہ ادھر نشے میں لہرائی ہوئی
رنگ لائی ہوئی چھائی ہوئی برسات کی رات

اف وہ سوئی ہوئی کھوئی ہوئی فطرت کی بہار
اف وہ بھیگی ہوئی بہکی ہوئی برسات کی رات

پھر وہ ارمان ہم آغوشی کا جذب گستاخ
آہ وہ رات وہ سلمیٰ سے ملاقات کی رات

کیوں نہ ان دو نول پہ مٹنے کی ہو حسرت اختر
اُف وہ اُس رات کی بات آہ وہ اُس بات کی رات

اس نظم کے پانچویں شعر میں شاعر نے سینے پر ہجوم زلف کا ذکر کیا ہے۔ یہ کچھ ایسی چیز تھی جس کی یاد اُس کے دل میں ہمیشہ چٹکیاں لیتی رہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ خود کہتا ہے ؎

کبھی نہ بھولیں گی اس شب کی لذتیں اختر
کہ میرے سینے پہ وہ زلفِ مشکبار رہی

اسی طرح جب ہر سال برسات آتی تھی۔ شاعر کو اُس برسات کی رات کی یاد ہمیشہ ستاتی تھی۔ ایک جگہ ایک غزل میں لاہور میں بیٹھا ہوا ان کا منظر گجرات میں چھینٹا پڑنے کا حال سن کر اپنے داغِ حسرت دل کی یوں نمائش کرتا ہے۔ کہ ؎

جھولا جھلائیں چل کے حسینوں کو باغ میں
گجرات میں سنا ہے کہ برسات ہو گئی!

اختر سلمیٰ کی طرح دیارِ سلمیٰ کا بھی جو صدیوں سے آذر کدۂ نیاز مندانِ شوق رہا ہے عاشق تھا۔ اور جب کبھی اس کے سامنے گجرات کا نام آتا۔ اس کا سر فرطِ جذباتِ عبودیت و احترام سے جھک جاتا ——

پس اگر خمِ ابروئے سلمیٰ اُس کی نمازِ عشق کے لیئے محرابِ عبادت تھا تو
گجرات بیت الحرام عشق و محبت۔ مہبطِ انوارِ حسن و جمالِ فطرت اور
مامنِ عیش و سکون و راحت ہے ؎

جائے حضور و گلشنِ امن است ایں سرائے
زیں در بشادمانی و عیش و طرب درآئے

اور پھر برسات کی اُن راتوں کے ابرِ فیض و برکات اور اس کی
روح پرور کیفیات نے تو اُسے کچھ اس طرح خاکِ پاکِ گجرات کا پرستار
بنا دیا تھا کہ وہ اکثر اس کعبۂ مراد کی یاد میں والہانہ جامی کا یہ نغمہ گاتا اور
جھومتا تھا کہ ؎

احنّ شوقاً الی دیارٍ لقیت فیھا جمالَ سلمیٰ
کہ مے رساند ازاں نواحی نویدِ لطفے بجانبِ ما
زہے جمالِ تو قبلۂ جاں حریمِ کوئے تو کعبۂ دل
فان سجدنا الیک نسجد وان سعینا الیک نسعیٰ

درحقیقت وہ گجرات کا عاشق تھا۔ اور اُس کا کلام گجرات کے
ذکر سے معمور رہے۔ جس میں ہر جگہ ایک عجیب جیسی اور حسین انداز میں گجرات
کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور اس نے اپنے خاص انداز میں سرزمین گجرات کے
عنوان سے گجرات پر وہ بے نظیر نظم لکھی ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گی چند

بند ملاحظہ ہوں ؎

اے سرزمین گجرات اے خلد زار الفت
پھولوں میں تیرے رقصاں سوزِ بہار الفت
تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدارِ الفت
اور یادگارِ الفت
اے سرزمین گجرات

عریاں ہے حسن تیرے سرسبز گلشنوں میں!
آوارہ عشق تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ تیرے پُرنور ایمنوں میں
رنگین مسکنوں میں
اے سرزمین گجرات

پھر آرزو کو رُسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے قدموں پر سر دھرنے کی آرزو ہے
مرنے کی آرزو ہے
اے سرزمین گجرات

گجرات کی اس یادگار ملاقات کے بعد اختر و سلمیٰ کی رنگین ملاقاتوں کا
سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ دن رات تھا اور رات شب برات
تھی ع

جوانی کی وہ راتیں مرادوں کے دن

کہ اسی اثناء میں ایک شب شاعر کو محبّت کی نشانی وہ انگوٹھی حاصل
ہوئی۔ جسے وہ ہمیشہ لوگوں کی آنکھوں سے چھپاتا۔ اور ایّام جُدائی میں
خلوت میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے لگاتا اور چومتا تھا کہ یہ انگشتری
درحقیقت اس کے دل کا نگینہ اور اس کی سلمیٰ کی یادگار تھی۔ اس خاتم
گوہر نگار پر اس نے ایک دلپذیر نظم لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چھپاؤں کیوں نہ دل میں خاتم گوہر نگار اس کی
یہی لے دے کے میرے پاس ہے اک یادگار اس کی

مری سلمیٰ کو اس نے شاد اور ناشاد دیکھا ہے
گہے مسرور گاہے مائلِ فریاد دیکھا ہے
شب تنہائی میں اس نے اُسے بیدار پایا ہے
اور اکثر دیدۂ سرشار کو خونبار پایا ہے!
اسے معلوم ہے وہ کس طرح مغموم رہتی تھی
کسی کے غم میں لطفِ زیست سے محروم رہتی تھی

مرا خط پڑھ کے وہ کس ناز سے مسرور ہوتی تھی
پھر اپنی بے بسی پہ کس طرح رنجور ہوتی تھی
یہ شاہد ہے کہ اس کی شام غم کیونکر گزرتی تھی
یہ شاہد ہے کہ وہ رو رو کے کیونکر صبح کرتی تھی

وہ جب دل تھام لیتی تھی ہجوم غم سے گھبرا کر
تو یہ کرتی تھی اس کی غمگساری اس کے پاس آ کر

اسے معلوم ہے جو درد تھا اس پاک سینے میں
بسی ہیں اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے نگینے میں

پہنچتی ہیں شعاعیں اس کی جس دم چشم حیراں تک
تصور مجھ کو لے اڑتا ہے سلمیٰ کے شبستاں تک

جہاں سلمیٰ کے اور میرے سوا ہوتا نہیں کوئی
انگوٹھی گھورتی جاتی ہے گو دیکھتا نہیں کوئی

یہاں اختر و سلمیٰ کی ملاقاتوں کے سلسلے میں یہ ایک خاص چیز بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ملاقاتیں جنسی ہواؤ ہوس کی آلودگیوں سے یکسر پاک اور منزہ اور سرتاسر معصومانہ تھیں۔

حرص و ہوس کی اس سیاہ کار دنیا میں یہ بات بظاہر ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکثر احباب میرے اس بیان کو تسلیم کرنے سے انکار کریں گے۔ بالخصوص اس لئے کہ اختر کی رندانہ اور بادہ گسارانہ زندگی۔ یعنی ع

عشق رسوا کی داستان خموش

سب کے سامنے ہے ——— مگر یہ ایک صداقت ہے اور اس پر زمین و آسمان گواہ ہیں۔ ع

من بہ عالم گواہ عصمت اوست

مجھے اختر کی بارسائی کی داستان بیان کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے وہ جو کچھ تھے دنیا جانتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سلمیٰ سے اختر کا عشق ایک مقدس عشق تھا ——— ایک ایسا عشق جو بلبل کو پھول سے، پروانے کو شمع سے۔ اور چکور کو آفتاب سے ہے ——— اور جب تک یہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اختر کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ وہ خود اس حقیقت کی جانب ایک

جگہ اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔ کہ ؎

قسم اُس پاکبازی کی جو تھی باہم خیالوں میں
قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اُس چاک دامانی کی جو مجبور وحشت تھی
قسم اُس پاک دامانی کی جو مغرور عفت تھی
محبت کی انہیں معصوم راتوں کی قسم تم کو
حقیقت کی انہیں موہوم راتوں کی قسم تم کو
فقط اتنا بتا دو کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں، آہ وہ راتیں وہ اب پھر نہ آئیں گی

اختر و سلمیٰ کے عشق و محبت کا افسانہ حسن و عشق کی ایک سر تا سر پاکیزہ اور مقدس داستان ہے۔ اور سلمیٰ کے آستانۂ جمال پر اختر کی حضوری عبادت ہے صرف اس نماز شوق سے جو عشق حسن کے حضور میں کمال خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ کہ ؎

مرا می بینی و در دم زیادت مے کنی دردم
ترا می بینم و شوقم زیادت مے شود ہر دم

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ایک رات اس کہانی کا ایک باب صرف اسی طرح ختم ہؤا۔ کہ سلمیٰ ساری رات اختر کے سامنے ٹپ ٹپ

آنسو گراتی رہیں۔ کہ ؎

جو قطرہ از سرِ مژگاں چکید نم بنگر

اور اختر سوز و ساز عشق کے آنسوؤں کے دریا میں بہتے رہے۔ تاآنکہ وقت رخصت قریب آیا۔ اور برادیم کدہ عشق کا یہ پجاری گھر واپس ہوا ــــــ اس رات کی آنسوؤں کی یہ دلگداز کہانی اس نے خود اپنی ایک نظم میں اس طرح ادا کی ہے ؎

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے تمہارے آنسو
بن گئے شام محبت کے ستارے آنسو
شمع کا عکس جھلکتا ہے جو ہر آنسو میں!
بن گئے بھیگی ہوئی رات کے تارے آنسو
مینہ کی بوندوں کی طرح ہو گئے سستے کیوں آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو
صاف اقرار محبت ہو زباں سے کیونکر
آنکھ میں آ گئے یوں شرم کے مارے آنسو
ہجر ابھی دور ہے میں پاس ہوں اے جانِ وفا!
کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمہارے آنسو
صبحدم دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا آنچل

میری چغلی کہیں کھا دیں نہ تمہارے آنسو

صدقے اس جانِ محبت کے میں اختر جس کے

رات بھر بہتے رہے شوق کے مارے آنسو

ے

من نہ آں رندم کہ ترکِ شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کارہا کمتر کنم

چوں صبا مجموعۂ گل را بآبِ لطف شست
کج دلم خواں گر نظر بر صفحۂ دفتر کنم

منکہ دارم در گدائی گنجِ سلطانی بدست
کے طمع در گردشِ گردونِ دوں پرور کنم

عہد و پیمانِ فلک را نیست اے دل اعتبار
عہد با پیمانہ بندم شرط با ساغر کنم

منکہ امروزم بہشت نقد حاصل مے شود
وعدۂ فردائے زاہد را چرا باور کنم

اختر اور عشق و عاشقی کے "ماحول" میں معروف تھے۔ کہ سلمیٰ کے عشق اور اس کے نتیجے میں ان کی دن رات کی خلوت گزینی یا کوچہ گردی مگر دور گھر کی زندگی سے بیزاری، دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی سود و بہبود سے

بے نیازی۔ ہر وقت کی شعر نوازی اور ہمہ وقت عیش کوشی و رندی و مستی اقربا اور اعزہ سے لاتعلقی ایک خاص قسم کے آوارہ و مجنوں اور سواسر بانالہ لوگوں کی طرح کی زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے سروکار ــــــ ــــــ یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنہوں نے اس رند خوش اوقات کے گھر والوں بالخصوص اس کے والد محترم کے دل میں اُس کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دیئے تھے۔ اور پھر یہ احساسات وقت اس اور بھی شدت اختیار کر گئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اختر سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد جو دیا باہر کہیں عشق کے دھندوں میں پھنس گئے ہیں۔

ساتھ ہی اِدھر شہر اور سوسائٹی کے بعض ثقہ قسم کے لوگ بالخصوص ان کے والد محترم کے بعض احباب بھی اختر کی اس وارفتہ کار زندگی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ان کی رنگینیٔ افکار اور رندانہ اور بے نیازانہ وآں زندگی پر طرح طرح سے نکتہ چینی اور طعنہ زنی فرماتے تھے۔

لیکن اختر اس نفرت کہ ہستی کی مصنوعی اور کاروباری زندگی کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا تھا اس کا دل ماحول اور دنیا والوں کے مطاعن سے

تنگ تھا اس لیے وہ اس دنیا سے دُور اپنے عشق کے سہارے ایک نئی دنیا بسانا چاہتا تھا ——— نیز وہ چاہتا تھا کہ اگر وہ اس دنیا کو نہیں بدل سکتا تو پھر وہ ایک ایسی دنیا میں جا بسے جہاں پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہر طرف شراب و شباب کی بہاریں اور مسرتیں آباد ہوں۔
چنانچہ کبھی وہ اپنی اس تمنا کا اظہار خضرِ عشق سے یوں کرتا کہ ؎

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے

دُور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم

بس تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ دَرد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی سفّاک نگاہوں کی

ظلموں کی جفاؤں کی آہوں کی کراہوں کی

ہیں غم سے حسنریں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دنیا

تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا

جنّت کی طرح رنگیں شاداب نما دنیا

للہ وہیں لے چل[1]

اے عشق کہیں لے چل

اور کبھی وہ اس پاپ کی بستی سے دُور جنّت کدۂ عشق کا تصوّر

کر کے اُسے یوں یاد کرتا تھا کہ ؎

اک سر زمین عشق ہے

ہنگامۂ عالم سے دُور، آفت گہِ ہستی سے دور

اس مکر کی دنیا سے دُور، اس ظلم کی بستی سے دور

اس رات اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دور

دورا از زمین و آسماں اک سر زمین عشق ہے

---

[1] یہ ایک طویل نظم کے چند بند ہیں۔

اُس کے گلستاں پُرفضا، اس کی بہاریں دلنشیں
اُس کی زمینیں خوشنما، اس کی فضائیں مرمریں
اُس کے نظارے دلکشا، اس کی ہوائیں عنبریں
مثلِ بہشتِ گل فشاں اک سرزمینِ عشق ہے

اور پھر کبھی وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی سلمیٰ ہی سے یوں التجا کرتا تھا۔ کہ ؎

مری سلمیٰ مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں
جہاں رنگین بہشتیں کھیلتی ہیں سبزہ زاروں میں
جہاں حوروں کی زلفیں جھومتی ہیں شاخساروں میں
جہاں پریوں کے نغمے گونجتے ہیں کوہساروں میں
جوانی کی بہاریں تیرتی ہیں آبشاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں

حکومت ہے جہاں صدق و صفا و مہر و الفت کی
نشاط و عیش و عشرت کی، سرور و لطف و راحت کی
نسیم و انجم و گل کی، نوائے نور و نکہت کی!!!
محبت موجزن ہے جن کے دوشیزہ نظاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں

جہاں آباد یہ ناپاک شہرستاں نہیں ہوتے
فسادی فتنہ پرور اور ذلیل انساں نہیں ہوتے
یہ انساں ہاں یہ حیواں بدتر از شیطاں نہیں ہوتے
فسادو شر جہاں سوتے ہیں خوابوں کے مزاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں[1]

شاعر اپنی سلمیٰ کے عشق و محبت میں سرشار دنیا اور دنیا والوں کے طعنہائے رسوائی سے بے نیاز اپنے عشق کے کاروبار میں مصروف تھا۔ اور ان ناصحان مشفق کے لیئے جو اسے اس راہ طلب سے بھٹکانے کی کوشش کرتے اس کا جواب یہ تھا۔ کہ ؎

امن انکرتنی عن حب سلمیٰ
غویق العشق فی بحر الوداد ی[2]

یا پھر وہ اپنے واعظوں سے یوں مخاطب ہوتا۔ کہ ؎

بروبکار خود اے واعظ ایں چہ افتاد ست
مرا فتاد دل از کف ترا چہ افتاد ست

---

[1] یہ بھی ایک طویل نظم کے چند بند ہیں۔ [2] ترجمہ:۔ تو مجھے سلمیٰ کی محبت سے منع کرتا ہے حالانکہ میں اس کی محبت کے دریا میں غرق ہوں۔ حافظ کا شعر ہے منہ

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا عام دوستوں اور ناصحوں کے پند و نصائح کے آزار و ایذار سے قطع نظر اختر کے لئے سب سے بڑا روح فرسا معاملہ یہ تھا کہ ان کے والد بزرگ و محترم ان کے اس طرز زندگی کی وجہ سے اُن سے یکسر بیزار ہو چکے تھے۔

اختر اپنے علم و ادب میں شہرۂ آفاق اور یگانۂ روزگار باپ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے۔ اور ان کے والد محترم کی دلی خواہش تھی کہ ان کی طرح ان کا ہونہار فرزند بھی اخلاقی اعتبار سے سوسائٹی اور ملک میں عزت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے ـــــ لیکن اختر کسی اور راہ پر پڑ گئے تھے۔ جہاں کا ہر مسافر ننگ و ناموس کے تاج کو سب سے پہلے سر سے اتار کر کسی کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے۔ کہ ؎

ما نمے خواہیم ننگ و نام را

اختر کے اس طرز بود و ماند کی وجہ سے اختر اور اُن کے والد محترم کے درمیان افتراق و شقاق کی ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ اور اس لیئے اختر کی گھر کی زندگی بے حد تلخ تھی۔ اور اب صورت یہ تھی کہ گھر اُن سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار ـــــ بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور اس مقصد کے لئے اکثر میرے غربت کدہ کو شرف انتخاب بخشا۔ لیکن پھر

کسی نے گھر والوں سے صلح کرا دی، اور وہ گھر تشریف لے گئے۔

اختر کا معمول یہ تھا کہ وہ اکثر رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ اور اس اثنا میں بارہا ایسا ہُوا کہ ان کے والد محترم نے غصّہ میں آکر مکان کے اندر سے زینے کے دروازہ کو قفل لگا دیا۔ اختر آتے اور اس دروازہ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیر اثر ان کی والدۂ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آکر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر باتیں کرتے رہتے اور اس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تھی۔ تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا۔

اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور — ان کی عادت یہ تھی کہ وہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں رہیں رات کو کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے یعنی مست و لایعقل رہنے اور اپنے دل چسپ مشاغل میں انہماک کے باوجود اس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے چنانچہ بارہا ایسا ہُوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں۔ دن بھر غائب رہتے اور رات کے دو بجے تشریف لاتے تھے۔

ان تمام امور کے باوجود اختر اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے

تھے۔ جو تمام تعزیرات اور سختیاں سہتے تھے لیکن اپنی شرافت نسبی و ذاتی کی وجہ سے کبھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔

درحقیقت وہ سلمیٰ کے سچے عاشق تھے اور ان کے عشق میں دُنیا کی ہر چیز کو بھول چکے اور بھلا چکے تھے۔ اور بالآخر وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کارِ من برآید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اور حقیقت یہ ہے کہ واقعی اس راہ میں انہوں نے اپنی جان جان آفرین کو سونپ دی۔

اب اس طرف اختر کا اگر یہ حال تھا تو دوسری جانب سلمیٰ کے حالات بھی کچھ ایسی ہی صورت اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ ادھر بھی سلمیٰ کے گھر کے خاص خاص لوگوں کو ان کی رومانی زندگی سے ایک حد تک واقفیت ہو گئی تھی۔ اور جب وہ یہ دیکھتے کہ سلمیٰ ہر وقت اُداس مضطرب اور پریشان گھر کے کاموں اور عام گھریلو زندگی کے مشاغل سے بیزار علیحدہ ایک گوشے میں بیٹھی ہر وقت کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ تو اس چیز نے اُن کے شبہ کو مبدّل بہ یقین اور غم و غصہ کی آگ کو اور مشتعل کر دیا تھا۔

یہ لوگ اب سلمیٰ کو ہر وقت رشک و غبطہ کی نگاہوں سے دیکھتے اور ان کی ——— کچھ اس انداز میں دیکھ بھال کرتے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک ناقابل برداشت بار محسوس کرنے لگی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب ان لوگوں کے طرزِ عمل سے اور شاعر کے غم میں دن رات مغموم اور محزوں رہتے رہتے درحقیقت بیمار ہو گئیں ——— اور آخر میں وہ اپنی اس تلخ زندگی سے اس حد تک تنگ آ گئیں ——— کہ ایک مرتبہ انہوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ شاعر نے اس وقت کے ان حالات اور کیفیات کو اپنی ایک نظم "اے عشق ہمیں برباد نہ کر" میں کچھ ایسے عجیب رومانی انداز میں نظم کیا ہے جس سے اس دور کے تمام حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی آنکھوں سے فروغ شام گیا

ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ روگ لگا ہے جب سے ہمیں رنجیدہ ہوں میں بیمار ہے وہ
ہر وقت تپش ہر وقت خلش بیخواب ہوں میں بیدار ہے وہ
جینے سے اِدھر بیزار ہوں میں مرنے پہ اُدھر تیار ہے وہ
اور ضبط کہے فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

بیدرد ذرا انصاف تو کر اس عمر میں اور مغموم ہے وہ
پھولوں کی طرح نازک ہے ابھی تاروں کی طرح معصوم ہے وہ
یہ حسن ستم یہ رنج غضب مجبور ہوں میں مظلوم ہے وہ
مظلوم پہ یوں بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق خدارا دیکھ کہیں وہ شوخ حزیں بدنام نہ ہو
وہ ماہ لقا بدنام نہ ہو وہ زہرہ جبیں بدنام نہ ہو
ناموس کا اس کے پاس رہے وہ پردہ نشیں بدنام نہ ہو
اس پردہ نشیں کو یاد نہ کر

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

امید کی جھوٹی جنّت کے رہ رہ کے نہ دکھلا خواب ہمیں
آئندہ کی فرضی عشرت کے وعدوں سے نہ کر بیتاب ہمیں
کہتا ہے زمانہ جس کو خوشی آتی ہے نظر کمیاب ہمیں!
چھوڑ ایسی خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اس اثنا میں اختر کو اس کے خاص ذرائع سے سلمیٰ کے ان مصائب کی خبر پہنچتی رہتی تھی۔ اور اس چیز نے اب اور بھی اس کی زندگی کے پیمانے کو درد و الم اور اندوہ و کرب سے معمور کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت یہ محسوس کرتا کہ سلمیٰ میری ہی وجہ سے ان آلام میں مبتلا ہوئی ہے کاش! میرے عشق کے ہاتھوں اس پر یہ ظلم و ستم کا پہاڑ نہ ٹوٹتا ؎

بر زلیخا ستم اے یوسف مصری مپسند
زانکہ از عشق بر او ایں ہمہ بیداد آمد

لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اب دونوں کے اختیار کے ہاتھوں سے باہر تھا۔ ایک دن اختر کو جس کی زندگی کی تمنا ہی یہ تھی۔ کہ کبھی سلمیٰ کا بال بھی بیکا نہ ہو یا کبھی صبا کے ہاتھوں سلمیٰ کے گیسو بھی پریشان

نہ بھول کہ ؎

کمن اے صبا مشوش سرِ زلفِ آں لبِ سیما
کہ ہزار جان حافظ بفدائے تار موئے

جب یہ علم ہوا کہ سلمیٰ غم عشق کے مصائب سہتے سہتے واقعی اب بیمار ہو چکی ہے تو انہوں نے عیادت کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جس کا یہ شعر مجھے کبھی نہیں بھولتا کہ ؎

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب
آج معلوم ہوا ہم کو علالت کیا ہے

۸

آشنا ہو کر تغافل آشنا کیوں ہو گئے
باوفا تھے تم تو آخر بے وفا کیوں ہو گئے
اور بھی رہتے ابھی کچھ دن نظر کے سامنے
دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا کیوں ہو گئے
اُن وفاداری کے وعدوں کو الٰہی کیا ہوا
وہ وفائیں کرنے والے بے وفا کیوں ہو گئے
تم تو کہتے تھے کہ ہم تجھ کو نہ بھولیں گے کبھی
بھولا کر ہم کو تغافل آشنا کیوں ہو گئے

ہر بہار کے بعد خزاں کا دور شروع ہوتا ہے۔ پس شاعر کی زندگی کے
بہار کے دن اب ختم ہونے کو آئے کہ سلمٰی کے گھر والوں نے حالات دگرگوں
دیکھ کر ایک جگہ اپنے قبیلے میں ان کی نسبت کی گفتگو شروع کر دی۔
سلمٰی عالم بے کسی میں ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھتیں،

سُنتیں اور دل ہی دل میں کہتی تھیں کہ ؎

محرمِ رازِ دلِ شیدائے خویش
کس نہ بینم خاص و عام را!

وہ رات بھر اپنے اختر کی یاد میں اختر شماری کرتیں کہ ؎

زچشمِ من بپرس اوضاعِ گردوں
کہ شب تا روز اختر مے شمارم!

اور جب ساری رات انتظار میں گزر جاتی تو وہ اپنے دلِ غم پرور سے یوں مخاطب ہوتیں ؎

بے غمت شاد مباد اے دلِ غم پرورِ ما
غم خور اے دل کہ بجز غم نبود در خورِ ما

اختر کو جب ان حالات کی خبر ہوئی کہ سلمیٰ طوعاً و کرہاً کہیں سلسلۂ ازدواج میں منسلک کی جا رہی ہیں اور اس لیئے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو کر موت کی گھڑیاں گن رہی ہیں تو ان دنوں ان کی حالت اس قدر غیر ہو گئی تھی کہ وہ غم سے نڈھال ـــــ دیوانہ وار دن بھر اِدھر اُدھر پھرتے اور رات بھر تڑپ تڑپ کر صبح کرتے ـــــ اور اس اثنا میں کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ انہوں نے مختلف ذرائع سے خودکشی کی

کوشش کی۔ کئی مرتبہ دار دیئے مرگ کی جستجو کی۔ اور ایک مرتبہ چھت کی بلندی
سے گر کر مرنے کی سعی کی۔ کہ انہیں پکڑ لیا گیا۔
سلمٰی کو جب ان حالات کا پتہ چلا کہ میرا شاعر مرنے کی طیاری کر رہا
ہے تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ اختر کو خودکشی سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ
انہوں نے اُن کو بلایا اور فرمایا کہ
"اختر! تا قیامت صبر کرو کہ یہ دنیا کی زندگی چند روز
کی ہے اور اس کے بعد خلود اور دوام کی زندگی شروع ہوگی
جو ہم اور تم ہمیشہ ایک جگہ بسر کریں گے۔
یہ صحیح ہے کہ دنیا والے یہاں ہمیں نہیں ملنے دیں گے۔ کہ
یہاں ظالم سماج اور معاشرت کے قوانین اور آئین کچھ اسی
طرح کے ہیں۔ لیکن وہاں تو کسی پر کسی کا زور نہ ہوگا۔"
سلمٰی اب سراپا سوز و گداز بن کر زار زار رونے لگیں اور ادھر
اختر بھی سلمٰی کے قدموں پر سر رکھ کر کچھ اس طرح روئے کہ بیتاب ہو گئے۔
دونوں پر دیر تک یہ حالت طاری رہی ——————
تاآنکہ سلمٰی نے اختر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اختر اب سحر ہونے کو آئی
اور اب کچھ دیر کے بعد ہمیشہ کے لئے ہماری آرزوئے دل کا پھول کھلا
جائے گا —— یعنی

تمتّع من شمیم عرار نجد ٭ فما بعد العشیّة من عرارٍ[1]

اس کے بعد سلمیٰ نے اختر کو گلے سے لگایا پھر دیر تک اُن کا منہ دیکھا اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے ایک حسرت ناک آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ

"اختر بجاؤ اب تم اور ہم حشر کے دن ملیں گے۔"

اختر پر یہ آواز برقِ بلا بن کر گری۔ وہ بے چین اور بے قرار ہو کر فرش خاک پر گر پڑے اور اس کے بعد جب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ہوش و حواس کو کسی قدر بجا کر کے گھر واپس لوٹے ——— لیکن چلتے وقت یہ سنا آئے کہ اچھا۔ میں اب حشر کے دن کا انتظار کروں گا اور اس انتظار میں یہ حشر کے سے دن کاٹ دوں گا ——— اور چونکہ اس دنیا میں اب میری یہ زندگی بے مصرف اور بے معنیٰ ہے۔ اس لیے جس قدر جلد ہو سکا میں ——— اسے جلد از جلد تباہ کر کے ختم کر دوں گا۔ اپنے ان اشعار میں انہوں نے ان چیزوں کو خود یوضاحت اس طرح ذکر کیا ہے کہ

دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کر لوں گا
تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

---

[1] ترجمہ: نرگس نجد کی خوشبو سے فائدہ اٹھالے کہ آج کی رات کے بعد پھر اس کا میسر آنا مشکل ہے۔ منہ

اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا!
جو تم سے دُنیا محروم رہ گیا ہے مجھے
میں اپنی زندگی صرف گناہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا حشر سے دن
تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا
کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اختر
جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

علاوہ ازیں مَیں نے اختر و سلمیٰ کے اس مجموعۂ مکاتیب میں بھی جس کا مَیں قبل ازیں ذکر کر چکا ہوں اختر کا ایک مکتوب بڑھا تھا جو اسی واقعہ سے تعلق رکھتا تھا اور جس میں اس نے سلمیٰ کو واضح لفظوں میں اس امر سے مطلع کر دیا تھا۔ کہ اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو میں اپنی زندگی کو مختلف طریقوں سے تباہ کر کے ختم کر دوں گا ــــ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس کے بعد کی زندگی ان کے اسی قول کے مطابق بسر ہوئی ہے۔ اور وہ تمامتر اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

اختر گھر واپس آنے کے بعد اب دن رات مصروفِ نالہ و شیون رہتے تھے ادھر سلمیٰ تھیں کہ مستقبل کی اندھیری اور اندوہناک ساعتوں کے تصور میں حیاتِ مستعار سے بیزار اور غم و الم سے سینہ فگار تھیں۔ غرض

اسی طرح یہ لیل و نہار گذرتے گئے اور شادی خانہ برباد کی تاریخ قریب آگئی۔ اُس وقت اختر نے یہ خانہ بر انداز دل و دماغ نظم لکھ کر سلمیٰ کی خدمت میں روانہ کی ——— چند بند ملاحظہ ہوں ؎

مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر پیاری چلی جاؤ گی کیا
میری نگاہِ شوق کو فرقت میں تڑپاؤ گی کیا
اُف حشر تک یہ چاند سی صورت نہ دکھلاؤ گی کیا
اور پھر نہیں آؤ گی کیا، پیاری چلی جاؤ گی کیا

کیا جنتِ دیدار سے محروم ہو جاؤں گا میں
اس محشر انوار سے محروم ہو جاؤں گا میں
ہاں کیا تمہارے پیار سے محروم ہو جاؤں گا میں
اُف یہ ستم ڈھاؤ گی کیا، پیاری چلی جاؤ گی کیا

کیا سن رہا ہوں آہ میں دشمن کے گھر جاؤ گی تم
اور اُس قفس سے پھر رہا ہونے نہیں پاؤ گی تم
میری تسلی کے لئے واپس نہیں آؤ گی تم
سچ مچ نہیں آؤ گی کیا، پیاری چلی جاؤ گی کیا

اور اس کے بعد حرماں نصیب سلمیٰ مجوزہ پروگرام کے مطابق سلسلۂ ازدواج میں منسلک کر دی گئیں۔ اور سیہ بخت اختر کو زندگی بھر کے لئے

غم والم کے صحراؤں میں بادیہ پیمائی کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اور اب وہ اپنے درزیباؔ کی قسمت پر جس میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈا جئے تو آفتاب نظر نہ آتا تھا یوں نوحہ خواں تھا کہ :-

یا بخت من طریق محبت فرو گذاشت
یا او بشاہراہ حقیقت گزر نکرد
من ایستادہ تا کنمش جاں فدا چو شمع
او خود گزر بمن چو نسیم سحر نکرد!
گفتم مگر بگریہ دلش مہرباں کنم
در سنگ خارہ قطرہ باراں اثر نکرد
در حیرتم کہ بہر چہ شد ہمدم رقیب
خر مہرہ ہیچ کس چو قرینِ گہر نکرد

سلمیٰ کی شادی کی رات اختر کے لئے ایک قیامت کا دن تھی! اس رات ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ـــــ وہ کبھی اُٹھتے اور دیوار سے سر پھوڑنے لگتے تھے۔ کبھی مرغ بسمل کی طرح زمین پر لوٹتے۔ کبھی بھاگتے اور چھت سے چھلانگ لگانے کی کوشش کرتے۔ کبھی دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنستے۔ اور پھر اس جانِ تمنا کو یاد کر کے زار زار رونے لگتے۔ جیسے وہ ابھی جی بھر کے دیکھ بھی نہ پائے تھے۔ کہ ؎

شربتے از لب لعلش نہ چشیدیم و برفت
روئے مہ پیکر او سیر ندیدیم و برفت

گوئی از صحبت ما نیک بہ تنگ آمدہ بود
بار بربست و بگردش نرسیدیم و برفت

بسکہ ما فاتحہ و حرز یمانی خواندیم
وز پیش سورۂ اخلاص دمیدیم و برفت

صورت او بلطافت اثر صنع خداست
ما بر آن نقش نظر سیر ندیدیم و برفت

ہمچو حافظ ہمہ شب نالہ و افغاں کردیم
کاے دریغا بوداعش نرسیدیم و برفت

۹

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے مے آید
کہ ز انفاسِ خوشش بوئے کسے مے آید
از غم ہجر مکن نالہ و فریاد کہ دوش
زدہ ام فالے و فریاد رسے مے آید
زآتشِ وادیِ ایمن نہ منم خرم و بس
موسیٰ اینجا باُمید قبسے مے آید!
دوست را گر سرِ پرسیدن بیمارِ غم است
گو بیا خوش کہ ہنوزش نفسے مے آید

سلمیٰ کی شادی ہوئے اب مدت ہو چکی تھی۔ اور وہ اب ایک طرح سے اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ لیکن شاعر کے سینے میں سلمیٰ کی محبت کا جو چراغ روشن ہوا تھا وہ ہمیشہ جلتا رہا اور اگرچہ اس کے لئے اب سلمیٰ سے ملنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم وہ ہمیشہ اس

کوشش میں رہا کہ جب بھی اور جہاں بھی اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ سلمیٰ کے نظارۂ جمال سے اپنے دل بے قرار کے لئے سکون کی کوئی گھڑی حاصل کر سکے۔

اسی اثنا میں ایک دن ایک ذریعے سے کاشانۂ اختر میں یہ اطلاع پہنچی، کہ سلمیٰ آج شام اپنے خاندان کے چند افراد کے ساتھ مزار نورجہاں پر سیر کے لئے جا رہی ہیں۔ اختر کو جب یہ مژدۂ جانفزا پہنچا تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے ان قریب رہنے والے دوستوں کو بھی جو ایک مدت سے اس کی پریشانئ حال کو دیکھ کر خود بھی اب بے حد آزردہ اور پریشان تھے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی۔ چنانچہ حلقۂ رنداں میں فرحت و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور وہ فرط مسرت و نشاط سے جھومنے اور اچھلنے لگے ؎

رندوں نے اس ادا سے کیا رقص نوبہار
پیمانہ کیا کہ وجد میں میخانہ آگیا

چنانچہ ابھی شام ہونے بھی نہ پائی تھی کہ سہ پہر ہی سے جبکہ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اور تمازت آفتاب سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج سوا نیزے پر آگیا ہے۔ شاعر اپنے چند دیوانوں کا ایک مختصر سا قافلہ لے کر راوی کی پُربہار وادی کی سمت روانہ ہوا۔ اور ساحل اس

دیارِ عشق کے غریب الوطن مسافر نے مقبرہ جہانگیر کے قریب ریلوے لائن کے اس پار اپنے لاؤ لشکر سمیت ایک درخت کی چھاؤں میں چھاؤنی چھالی۔ آہ ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

سورج ڈھلتا گیا اور آفتاب نے درختوں کو اپنی طلائی کرنوں کے ہار پہنا کر سارے چمن کو بقعۂ انوار بنا دیا۔ کہ اتنے میں شام نے اپنا سیاہ دامن پھیلایا۔ اور سیاہ برقع میں ملبوس ہمارے جہانگیر کی نورجہاں کی سواری آئی۔ وہ گاڑی سے اتری اور خراماں خراماں رفتارِ ناز سے حشر اٹھاتی ہوئی مزار نورجہاں کی عمارت کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

شام کا سہانا منظر تھا اور فضا پر سکوت طاری تھی۔ اس عالم میں مزارِ نورجہاں کے سامنے جب حسن و جمال فطرت ربانی کا یہ پیکر نورانی، ہزاراں شان دل ربائی جلوہ آرا ہوا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس وادیٔ ایمن میں نکہت و نور کا ایک طوفان آگیا۔ حسن برہم کے ہاتھوں بزم مجاز کے پردے اُٹھنے لگے۔ حجاب قدس ہلنے لگا اور عالم ارواح میں کہرام مچ گیا۔ آہ ؎

یہ کس نے جلوہ ہمارے سرِ مزار کیا
کہ دل سے شور اٹھا ہائے بیقرار کا

اسی اثناء میں اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا اور کچھ فاصلے سے اسے اپنے تیر کا نشانہ نظر آیا تو اس نے ایک ہی نگاہ میں اس سے کچھ کہہ کر اپنا رخ مزار کی طرف پھیر لیا۔ اور پھر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھاتے وقت مزار کی جانب اشارہ کیا ـــــ یہ اشارہ شاید دنیا کی بے ثباتی اور نورجہاں کے عشق کے انجام کی جانب تھا ـــــ اور قدرت کا کھیل دیکھئے کہ واقعی اختر و سلمیٰ کے افسانے کا خاتمہ بھی کچھ اسی طرح ہوا۔ یعنی ہمارا جہانگیر آج گوشۂ لحد میں مصروف خواب ہے اور ہماری یہ نورجہاں "سلمیٰ" اس کی یاد میں مضطر و بے قرار اپنی موت کا انتظار کر رہی ہے آہ ؎

حکایت اپنی رندادجہاں معلوم ہوتی ہے

اس وقت جب کہ اس حسن سوگوار نے پیچھے کی طرف مڑ کر کچھ دیکھا تھا۔ تو چہرۂ رنگیں کے ایک گل رخسار پر زلف عنبریں نقاب بنی ہوئی اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ مستوں نے جب یہ منظر دیکھا تو بے ساختہ حافظ یاد آگیا۔ کہ ؎

گلبرگ را ز سنبل مشکیں نقاب کن
یعنی کہ رخ بپوش و جہانے خراب کن

پھر اس وقت ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ سلمیٰ جب مزار کے سامنے

آگے کھڑی ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے (شاید لائن خراب ہو جانے کی وجہ سے) اقرب میں بجلی کے لیمپ خاموش ہو گئے۔ امیر مینائی کا یہ شعر اس وقت مزہ دے گیا۔ کہ ؎

لحد پہ میری کوئی برقع پوش آتا ہے
چراغ گورِ غریباں صبا بجھا دینا

اس کے بعد سلمیٰ فاتحہ سے فارغ ہو کر کچھ دیر ادھر ادھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ٹہلیں اور پھر اپنی گاڑی کے پاس کھڑی ہو کر کچھ سوچتی رہیں اور اس کے بعد اس گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔

شاعرِ دیر تک دور سے کھڑا یہ سماں دیکھتا رہا۔ تاآنکہ وہ نورجہاں نگاہوں سے غائب ہو گئی اور اس پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ حافظ نے صدیوں پہلے شاید اسی وقت اور اسی نورجہاں سے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

تا رفت مرا از نظر آں نورِ جہاں بیں
کس واقفِ ما نیست کہ از دیدہ چہا رفت

مزار نورجہاں پر سلمیٰ کی آمد کی یہ دل گداز کہانی اختر نے ایک نظم میں اشکِ غم پنہاں کی ہے۔ چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

فضائے غم میں مسرت سی جھلملائی ہے

خزاں کی شام پہ صبحِ بہار چھائی ہے
مزارِ نورجہاں پر وہ غرغرغ آئی ہے
گماں ہے خلد سے حورِ جناں نکل آئی
نقابِ گل سے شمیمِ نہاں نکل آئی
کہ اپنی قبر سے نورجہاں نکل آئی

اندھیرے مقبرے میں غم سے یوں پریشاں ہے
فضا کی گود میں گویا کہ شمعِ گریاں ہے
شبِ سیاہ میں ستارہ اشک افشاں ہے

طلائی ہاتھ اٹھے کس کے فاتحہ کے لیئے
فضائیں ہو گئیں بیتاب التجا کے لیئے
خدائی کانپ اٹھی جذبۂ دعا کے لیئے

الٰہی! اگر اسے نورجہاں بنانا تھا!
مرے نصیب کو یوں کامراں بنانا تھا
مجھے بھی خسروِ ہندوستاں بنانا تھا

کہ ایک دن بھی نورجہاں مری ہوتی
جو آج غیر کی ہے داستاں مری ہوتی
یہ غمزدہ بدل شادماں مری ہوتی

یہ کس نے چپکے سے تربت کی سمت اشارہ کیا
بتا کے حسن کا انجام دل دوبارہ کیا
اور اپنا رازِ غمِ عشق آشکارہ کیا

شعاعِ ماہ جواں کو فگار دیکھا ہے
نسیم خلد کو ماتم گسار دیکھا ہے
کسی نے حسن کو یوں سوگوار دیکھا ہے

۱۰

شرح غمہائے زمانہ سن لے
اپنی زلفوں کا فسانہ سن لے
کتنی غمگین ہے شرح خاموش
قصۂ بزم شبانہ سن لے
چاندنی اور یہ سہانی راتیں
آ کے فرقت کا فسانہ سن لے
سوزِ غم اک ابدی لذت ہے
سازِ ہستی کا ترانہ سن لے

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ اختر رات عذرا سلمیٰ کی یاد میں رو تے اور دن بھر ان کے حسین تصور کی رنگینیوں میں محو رہتے۔ اور اگرچہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سلمیٰ کا حصول اب ناممکن ہے۔ بایں ہمہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی سلمیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوئے وہ ہر وقت سلمیٰ کو یاد کرتے

اور اُن ہی کی یاد میں تڑپتے تھے۔ اُن کی زندگی کا سہارا سلمیٰ کا تصور تھا۔ اور ان کے افکار کا سرمایہ سلمیٰ کی یاد تھی۔ چنانچہ ان کا تقریباً ہر شعر سلمیٰ کی یاد کی یادگار ہے۔ اور وہ جب تک جئے سلمیٰ ہی کو یاد کرتے اور سلمیٰ ہی کے انتظار میں جیتے رہے۔

سلمیٰ بھی ان حالات سے باخبر تھیں۔ اور وہ اگرچہ رسوم و قیود زمانہ کے ہاتھوں صحبت ناجنس کے عذاب الیم میں مبتلا کر دی گئی تھیں۔ لیکن وہ یہیں ستم ہائے روزگار رہنے کے باوجود اختر کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہیں۔ اور آج بھی جبکہ اختر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ وہ ہمہ وقت ان کی یاد میں اشکبار، اُن کے غم میں ماتم گسار اور ان کے ماتم میں سوگوار ہیں۔

ایک دن سلمیٰ کو پھر جب اختر کی ان لیل و نہار کی جانکاہ بیقراریوں کا علم ہوا اور انہوں نے سنا کہ اختر اس طرح جلد از جلد اپنی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار اور اختر کو بلا کر اس سلسلے میں اُن سے گفتگو کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اب اختر کو بستی سے دُور گجرات کی ایک وادی میں پھر ملاقات کی دعوت دی۔ اختر کو جب یہ بلاوا پہنچا تو وہ۔ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

اور اسی عالم کیف و مسرت میں انہوں نے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

بہار و کیف کی بدلی اُتر آئے گی وادی میں
سرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

ابھی سے جا ئیں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرش گل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دیں مستیاں پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

مرے آغوش میں ہو گا وہ جسم مرمریں اُس کا
وہ اُس کے کاکل مشکیں وہ روئے نازنیں اس کا
وہ رخسار حسیں اس کے وہ حسن یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

اختر اب کشاں کشاں اس نور کی وادی میں پہنچا اور رات گئے وقت وہاں پہنچ کر کچھ دیر ادھر اُدھر گھڑا دیکھتا رہا۔ اچانک جھاڑیوں کے ایک ہجوم میں سے سلمیٰ جلوے بکھیرتی ہوئی نمودار ہوگئیں ع

کہ آفتاب بر آمد نقاب بکشود ہ

اختر نے جب یہ سماں دیکھا تو وصل یار کی خوشی میں فرط مسرت و انبساط سے باغ باغ ہو گئے ——— لیکن اس غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ دعوت ملاقات نغمۂ تہنیت وصال یار نہیں بلکہ نوحۂ تعزیت ہجر و وفا ہے۔

سلمیٰ اب اختر کی طرف بڑھیں اور انہوں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ

"اختر! مجھے تمہاری بیتابیوں اور بے قراریوں اور اس زندگی سے بیزاری کا حال معلوم ہے۔ اور تم یقین کرو کہ میں بھی تمہاری طرح مضطرب و بے قرار ہوں۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اس دنیا میں اس دنیا کی چند روزہ زندگی گزارنے کے لئے جبراً ان حالات میں اسیر کر دی گئی ہوں۔ اور اب میرے نسبی ننگ و ناموس کا تقاضا یہ ہے۔ کہ جس آزمائش میں میں مبتلا کر دی گئی ہوں پوری ذمہ داری

اور صبر و استقامت کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہو جاؤں۔ ——— اور جس طرح ہو سکے یہ وقت گزار دوں۔ تاآنکہ فرشتۂ اجل مجھے اس حرماں کدۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیئے جدا کر کے اس جہان میں پہنچا دے جہاں کسی انسان، شقی القلب انسان کی دسترس مجھے تم سے جدا نہ کر سکے۔

بس تم یقین کرو کہ یہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے اور اس کے بعد تم اور ہم انشاء اللہ حشر میں ملیں گے۔ لہٰذا تم اس سرائے فانی کی چند روزہ زندگی کو شمع کی طرح رو کر یا ہنس کر جس طرح چاہو گزار لو اور اس وقت کا انتظار کرو جبکہ تم اور ہم ایک ہی جگہ بہشت کی وادیوں میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس کے بعد اختر و سلمیٰ دونوں دیر تک روتے رہے اور اس قدر روئے کہ بے ہوش ہو گئے اور پھر اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اس طرح جدا ہوئے کہ پھر جیتے جی نہ مل سکے۔

اختر سے سلمیٰ نے حشر کے دن کی ملاقات کا تذکرہ دو مرتبہ کیا ہے۔ ایک شادی سے چند روز پہلے اور دوسری بار اس وقت ——— اور اختر پر اس چیز کا اتنا گہرا اثر تھا کہ انہوں نے اکثر اپنے کلام میں اس کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس نظم میں جو آپ نے "پیاری چلی جاؤ گی کیا" کے عنوان سے شادی سے چند روز پہلے لکھ کر سلمیٰ کی خدمت میں ارسال کی ہے اس "حشر کی بات" کی جانب ایک نہایت دل گداز انداز میں اشارہ کیا ہے۔

علاوہ ازیں اس نظم میں جس میں آپ نے سلمیٰ کو بتایا ہے کہ اب میں اپنی باقیماندہ زندگی تباہ کر لوں گا۔ آپ حشر کا ذکر ایک جگہ ایک عجیب لطیف انداز میں یوں کرتے ہیں کہ ؎

تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا حشر سے دن
تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا

پھر ایک اور جگہ آپ اس حشر کی بات کو یوں یاد کرتے ہیں کہ ؎

تا حق نہ دردِ عشق کی ہمدم دوا کریں
تا حشر یہ خلش نہ مٹے یہ دعا کریں
اختر نہیں ہے دردِ محبت کا کچھ علاج
ہو کوئی اور درد تو تیر دوا کریں

پھر ایک منظوم شکایت نامہ میں آپ اس حشر کی بات کی جانب اشارہ کر کے اپنے انجامِ محبت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ ؎

دردمند دل پہ یہ ظلم او ستم ایجاد نہ کر

میری امیدوں کی فردوس کو برباد نہ کر
اس پہ راضی ہوں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کر
بن کے انجان مگر مائل فریاد نہ کر

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا چاہتا ہے
عشق پردہ نشیں بے پردہ ہوا چاہتا ہے

پھر نہ کہنا کہ عبث کر دیا بدنام ہمیں
پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں
یا یہ حیلہ کہ نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں
آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں

دیکھ لینا یہ بہانے نہیں کام آئیں گے
تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے

میرے انجام پہ پچھتاؤ گی تم یاد رہے
اپنے اس ظلم سے شرماؤ گی تم یاد رہے
اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم یاد رہے
حشر تک پھر نہ چین پاؤ گی تم یاد رہے

رفتم از دست تو اے غارت ایماں رفتم
بہ ہوایم نہ شتابی کہ شتابان رفتم

اور پھر ابھی ایک اور دل گداز نظم میں جو آپ کی چند بلند پایہ نظموں میں سے ایک ہے آپ نہایت واضح الفاظ میں اس وعدۂ حشر کی گفتگو کا تذکرہ کر کے سلمیٰ کو یوں دعوتِ ملاقات دیتے ہیں کہ ؎

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ
چمن کی گود میں آ کر سما بھی جا سلمیٰ
کلی کلی میں بہار بن بسا بھی جا سلمیٰ
مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ملیں گے حشر میں مت کہہ یہ بار بار مجھے
ہو کیسے حشر کے وعدے پہ اعتبار مجھے
خدا کے دل پہ نہیں کوئی اختیار مجھے
خدا کو مان یہیں حشر اٹھا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

نشاطِ عمر کو امید پر نثار نہ کر
وصالِ صبحِ قیامت کا انتظار نہ کر
ریاضِ خلد کی باتوں کا اعتبار نہ کر
فریبِ وعدۂ فردا مٹا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں
فضائے روضۂ جنت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

خبر لے جلد کہ عمرِ عزیز فانی ہے
سرائے دہر کی ہر چیز آنی جانی ہے
برنگِ ابرِ رواں فصلِ نوجوانی ہے
چھلکنے والا ہے ساغر پلا بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

ثباتِ عہد زمانے میں کس نے پایا ہے
زمانہ رنگ بدلنے کو رنگ لایا ہے
بہارِ عمرِ رواں بادلوں کا سایہ ہے
بہارِ عمر کی خوشیاں منا بھی جا سلمیٰ

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں

خدائی ہو کہ خدا ہو بھلائے بیٹھے ہیں!!
سرودِ عہدِ جوانی لُٹائے بیٹھے ہیں!
تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ ہلکی ہلکی پھواریں نظر نہ آئیں گی پھر
شرابِ عیش و مسرت لُنڈھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے
خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دی ہیں یوں ہی زندگانیاں ہم نے
دمِ اخیر تو غم سے چھُڑا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

فنا نصیب ہیں یہ سبزہ زار کے منظر
یہ کوہسار و لبِ جوئبار کے منظر
نظر نہ آئیں گے پھر یہ بہار کے منظر

ابھی سماں ہے بہاریں دکھا بھی جا ساقی
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا ساقی!

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج
نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج
اجل پہ بھی مری مستی کو اختیار ہے آج
غرورِ عشق کی ہمت بڑھا بھی جا ساقی!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا ساقی!

۱۱
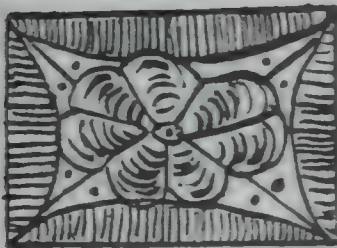
شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں
کہ بمژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں

مست بگذشت و نظر بر من درویش انداخت
گفت کای چشم و چراغ ہمہ شیریں سخناں

تا کے از سیم و زرت کیسہ تہی خالی بود
پند ما بشنو و برخور ز ہمہ سیم تناں!

کمتر از ذرہ نہ پست مشو مہر بورز
تا بخلوت گہ خورشید رسی چرخ زناں

دامن دوست بدست آر و ز دشمن بگسل
مرد یزداں شو و ایمن گذر از اہرمناں

بر جہاں تکیہ مکن ور قدحے مے داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

گفت حافظ من و تو محرم ایں راز نہ ایم
از مے لعل حکایت کن و سیمیں ذقناں

اختر نے حافظ کی یہ غزل صبح بہار میں سلمیٰ کے نام پر نذر کی ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ درحقیقت اشارہ ہے مرشدِ عشق کی اس تعلیم کی جانب جو شاعر کو وادیٔ ایمن گجرات میں دی گئی۔ جب کہ اسے یہ سمجھایا گیا کہ یہ بہار باغِ دنیا چند روزہ ہے اور اس کے بعد ابدیت اور خلود کی زندگی ہے جو ہم تم مل کر بسر کریں گے۔ باقی رہی موجودہ حیاتِ مستعار تو اسے تم چند روز کے لیے اس عارضی جہانِ رنگ و بو میں جس طرح چاہو ہنسی خوشی بسر کر لو ——— اور سچ یہ ہے کہ سلمیٰ کے عشق میں ناکامی کے بعد اختر کی بقیۂ زندگی سالکِ رہِ منازل کے اشارہ کے بموجب کچھ اسی طرح بسر ہوئی ہے کہ ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

ورنہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اس سے پہلے اختر کی یہ زندگی نہ تھی جو انہوں نے بعد میں اختیار کی ——— چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس رندی و ہوسناکی اور تباہ کارانہ جد و جہد کی زندگی کی ابتدا سلمیٰ کے یوم مفارقت سے ہوتی ہے۔ جب کہ قبل از وقت انہوں نے سلمیٰ کو اس امر سے آگاہ کر دیا تھا۔ کہ ؎

اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا

جو ظلم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرف گناہ کر لوں گا

اختر طبعاً نہایت بلند سیرت اور شریف طینت انسان تھے اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ اخلاق و محاسن انسانی کی تمام خوبیاں ان میں بدرجۂ اتم جمع تھیں ؎

لیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد[1]

وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق، حلیم، شریف اور دوست نواز دوست تھے۔ وہ عطا پاش اور خطا پوش تھے۔ اور اس قدر غیور تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حسن کی سرکار کے سوا کبھی کسی امیر نہ وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختر غیرت شاہانہ رکھتے ہیں

---

[1] ابو نواس کا شعر ہے۔ ترجمہ:- اللہ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں کہ تمام عالم کی خوبیاں ایک ہی ذات میں جمع کر دے۔ منہ

یہ سچ ہے کہ بسا اوقات شراب کے لیئے وہ حالتِ بےخودی میں ضرور مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں تو انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ درحقیقت ایک مردِ قلندر اور فقیر خاک نشین تھے اور ان کا وظیفۂ حیات یہ تھا کہ ؎

دولتِ فقر الٰہی بمن ارزانی دار کایں کرامت سبب حشمت و تمکین من ست

وہ نیک فطرت انسان تھے اور ان کے دل میں مہر یار کے سوا کسی کے کینۂ و حسد کے لئے جگہ ہی نہ تھی ؎

دلم خانۂ مہر یار ست و بس
ازاں مے نہ گنجد در و کین کس

ان کی سیر چشمی اور مال و منال دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹونک ان کی خدمت میں سات سو روپے بھیجے۔ وہ جب ان کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تاآنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف ایک پانچ روپیہ کا نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا

وہ بے حد ہمدردِ بنی نوع انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا اکثر رو پڑتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ بھی

دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ٹانگے میں سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہے اسے فوراً دے دو میں عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

پھر شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ (چند ہم پیالہ لوگوں کے سوا) جب کسی کو آتا دیکھتے شراب کی بوتل کو فوراً اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش کرتے۔ حتیٰ کہ میرے ساتھ بھی ہمیشہ یہی سلوک رہا۔

اور رقیق القلب اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند مرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں۔ وہیں بیٹھ کر دیر تک انہیں دیکھتے اور روتے رہے۔ اور پھر ان کلیوں پر وہ نظم لکھی جو اس عالم نکہت و رنگ میں ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی اور دماغوں کو مہکاتی رہے گی۔ کہ ؎

مجھے تو کچھ انہیں پیار کلیوں سے محبت ہے

بس حقیقت یہ ہے کہ اختر اپنے ادب اور آرٹ کی طرح اخلاق انسانیت اور ذاتی و نسبی شرافت کے اعتبار سے بھی ایک بہت بڑے انسان تھے۔ ایک اتنے بڑے انسان جو قرنوں کے بعد اس خرابہ زار میں آتے ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات　　تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لسان الغیب نے صدیوں پہلے اسی اختر کے لئے کہا تھا کہ ع

گردد دل نیاورد چو تو اختر بعد قراں

یہ سچ ہے کہ جیتے جی اس ناقدر شناس دنیا نے اس یگانۂ روزگار انسان کی وہ قدر نہ کی جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس دنیا کی پرانی رسم کے مطابق امرء القیس اور حافظ کی طرح اس کے بادۂ کہن کی قیمت بھی بڑھتی جائے گی۔ اہل دل اس کی خاک آستاں کو توتیائے چشم بنائیں گے۔ ارباب وجد وحال اس کے کلام رنگین کو جس میں اس نے اپنے دل کی کہانیاں بیان کی ہیں پڑھ پڑھ کر جھومتے اور رقص کرتے رہیں گے۔ سینوں میں اس کے سوز دل کا فانوس شمع حرم اور چراغ دیر کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ دجلہ و نیل اور گنگ وجمن کی طرح اس کا افسانۂ دل ہمیشہ دلوں کی کھیتیوں کو شاداب رکھے گا۔ بستی کی لڑکیاں عشق سلمیٰ میں اس کی شہادت پر عقیدت کے پھول چڑھائیں گی — مردانِ عشق اس کے آستانۂ عظمت وجلال پر سرِ نیاز جھکائیں گے —

— اور دلوں کی بستیاں ہمیشہ اس کے ذکر سے آباد رہیں گی۔ کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق!!
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

اور حق یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہی عاشقانِ سوختہ دل کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ ؎

عاشقِ سوختہ دل تا بہ بیابانِ فنا
نرود در حرمِ دل نشود خاص الخاص

اختر کے اخلاق و شمائل حمیدہ اور فضائل و خصائل پسندیدہ سے متعلق یہ چند کلمات ہم نے یہاں ضمناً عرض کر دیئے۔ تفصیل کے ساتھ ہم اس باب میں سب کچھ اس کتاب میں ذکر کریں گے۔ جو ہم حیاتِ اختر پر مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سلمیٰ کے حصول میں ناکامی کے بعد اختر نے اب اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لیئے رندی و مستی اور رہوسناکی و حسن پرستی کو آہستہ آہستہ اپنا شیوہ بنا لیا۔ اور اگرچہ اس اثنا میں انہیں بارہا اپنی بلندیٔ سیرت اور شرافتِ طینت کی وجہ سے اس امر کا احساس ہوا کہ اس بدنام اور خستہ و خراب زندگی سے جو انہوں نے اختیار کی ہے اُن کے لیئے سلمیٰ کے عشق میں مر جانا زیادہ اچھا ہے۔ جیسا کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ ؎

ہو گئے ناکام ہوس کار ہوئے کیوں اختر
عشق سلمیٰ میں جوانی کو لٹوا دینا تھا

لیکن اب جونکہ حالات نے انہیں اس راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس لیئے وہ اس پر چلتے گئے۔ تا آنکہ وہ دل پر سلمیٰ کی محبت کا داغ لیئے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو گئے۔

سلمیٰ کی مفارقت کے بعد سب سے پہلے عذرا کچھ مدت تک اُن کی باقیماندہ زندگی کی دلچسپیوں کا مشغلہ بنی رہیں۔ جن کے لیئے انہوں نے کئی سفر کیئے اور جن کے انتظار میں انہوں نے ایک مدت تک ایک پہاڑ پر رہ کر بہار سے دن کاٹے۔ عذرا شادی سے پہلے لاہور میں مقیم تھیں۔ بعد ازاں انہوں نے ایک جگہ الگ پار اپنی بستی بسا لی۔ ایک رومانی غزل جس کے یہ چند اشعار عرض خدمت ہیں ان ہی کی یاد میں لکھی گئی ہے کہ ؎

یاد آؤ مجھے للہ نہ تم یاد کرو!!
اپنی اور میری جوانی کو نہ برباد کرو
بستیاں اپنی الگ پار بسانے والو!
کبھی راوی کے کنارے دل کو بھی آباد کرو
خیبر اور اس کے نواحی میں ٹہلنے والو!
کبھی لائنس کے لارنس کو بھی یاد کرو

سرحد اور اس کے مناظر ہیں طرب ناک مگر
کبھی پنجاب کے سینے کو بھی آباد کرو

اس کے علاوہ اُن کی نظم "چند لمحے عذرا کے ساتھ" اس وقت کی یادگار ہے جب کہ عذرا نے گُلفر نامی ہوٹل کے بجائے ان کے فلیمنگ روڈ کے ایک تنگ و تاریک کلبۂ احزاں کو اپنے حسن کے جلوؤں سے بقعۂ انوار بنایا تھا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کوئی مہ جبیں جب جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شام بہار آ گئی
فضاؤں کو جلوؤں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی
سیہ پیرہن پر ستاروں کا رنگ
کہ تاروں بھری رات شرما گئی
بڑھی جیسے صبح بنارس بڑھے!
اُٹھی جیسے شام اودھ چھا گئی
شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے
کہ جیسے چمن میں بہار آ گئی!

له اور اختر کا یہ شعر بھی کہ "رات [illegible] جب وہ ماہ سیہ پوش آیا - [illegible] کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا"۔ اسی داستان سے وابستہ ہے۔ منہ

وہ ابریشمیں بال کرنوں کے ہار
وہ چوٹی کہ ناگن سی بل کھا گئی!!!
بدن جیسے معصوم کلیوں کا خواب
کمر یا کوئی شاخ لہرا گئی
یہ افسانہ ہے مختصر اس طرح!
کہ اختر کے پہلو سے عذرا گئی

عذرا کے بعد سندھ کی زلیخا۔ لکھنؤ کی ایک ماہ لقا، امرتسر کی ایک نوبہار نازنِ یگانہ، زہرہ۔ پروین۔ ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رخ، شمسہ۔ لیلیٰ اور سب سے آخر میں تنویر۔ ان کے بت کدۂ تصورات اور ان کی منظوم داستانوں کی زینت بنی ہیں۔

زلیخا سندھ کے ایک بہت بڑے گھرانے کی شمع ہیں۔ اور اس زمانے میں جب کہ ان سے اختر کی مراسلت جاری تھی وہ دہلی کے ایک کالج میں تعلیم پاتی تھیں۔ اور اس لئے وقتاً فوقتاً ان کا گزر اس سمت سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب اختر کو معلوم ہوا کہ زلیخا کالج کی چھٹیوں میں دہلی سے سندھ جاتی ہوئی لاہور سے گزریں گی۔ تو انہوں نے بطور خیر مقدم یہ پُر بہار نظم لکھی کہ :-

راہِ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے
خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

پھر اُٹھا وادیٔ جمنا سے وہی ابرِ بہار
جس کے سائے میں وہ خوشبوئے دل آتی ہے

جسمِ پنجاب تھا بے روح و رواں مدت سے
جسمِ پنجاب میں وہ روح و رواں آتی ہے

گلشنِ دہلی میں دل اس کا نہ بہلا شاید
سوئے لارنس جو وہ سرو رواں آتی ہے

دامنِ دل کو سکھانے کے لئے درسِ جنوں
مصرِ دہلی سے زلیخائے جواں آتی ہے

نئی دہلی کی فضائیں تھیں معطر جس سے
سوئے لاہور وہ فردوسِ رواں آتی ہے

پھر مئے شوق سے سرشار ہوا ہوں اختر
پھر مرے لب پہ غزل رقص کناں آتی ہے

اور جب زلیخا لاہور سے گزریں تو اختر نے یہ نظم رنگیں (جو پہلے انہوں نے ایک رسالے میں طبع کرائی تھی) اسٹیشن پر پہنچ کر جرأت کر کے ریل کے ڈبہ میں زلیخا کے ہاتھوں تک پہنچا دی۔

اسی طرح جب زلیخا ایک مرتبہ پھر سندھ جاتی ہوئی لاہور سے گزریں تو اختر نے یہ اشعار ان کی خدمت میں نذر کئے۔ کہ ؎

سامان رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا
لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا
مانا کنارِ سندھ ہے مضطر ترے لیئے
کچھ تو علاجِ پہلوئے پنجاب کر کے جا
ہے تشنہ کامِ عشق کو مدت سے انتظار
اے ابرِ حسن آج تو سیراب کر کے جا
چلنے لگی نسیم مچلنے لگی شمیم!!!
غرقِ نشاطِ جامِ مئے ناب کر کے جا
آواز دے رہا ہے برائے سفر کوئی
اختر کی چشمِ شوق کو پُر آب کر کے جا

اور پھر ایک مرتبہ جب گرمیاں گذارنے کے لیئے اس زلیخائے جواں نے سندھ سے شملہ آنے کا ارادہ کیا تو اختر نے اس کی "خوش آمدید" میں یوں غزل سرائی کی کہ ؎

شملے وہ ماہِ رواں آنے کو ہے!!!
اس زمیں پر آسماں آنے کو ہے

بھرپا بوسی بڑھا ابرِ بہار !!!
وہ بہارِ گل فشاں آنے کو ہے
جس سے تھی مہکی ہوئی وادیٔ سندھ
آج وہ بوئے رواں آنے کو ہے
شاعرانِ شہر سے جا کر کہو !!!
میرا الہام جواں آنے کو ہے
سندھ کے ساحل سے لہراتا ہُوا
رنگ و بو کا کارواں آنے کو ہے
اس کا استقبال کرنے کے لئے
دولت ہر دو جہاں آنے کو ہے
بے خودی میں کیوں نہ اختر جان دے
آج وہ جانِ جہاں آنے کو ہے

زلیخائے سندھ نے اختر کی طرف جب اپنی ادب نوازانہ توجہات مبذول کیں تو اس کی ابتدا، ایک خط سے ہوئی جس میں انھوں نے اپنے وطن پروارانہ احساس کے ماتحت اختر کو لکھا تھا کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے۔ اور اس پر اختر نے خط کی رسید کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں انھوں نے بار بار اس فقرہ کو دہرایا۔ اور ایک جگہ لکھا کہ ؎

کس نے پوچھا ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے
کیسے بتلاؤں کہ اندیشۂ رسوائی ہے

ماہ لقائے لکھنؤ بھی ایک مدت تک اختر کی شاعرانہ دلچسپیوں کی مرکز بنی رہی ہیں۔ یہ خاتون لکھنؤ کے ایک عالی خاندان کی رونق اور بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ اختر جب ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے تو وہاں کی شاعرانہ اور ادب پرورانہ مہماں نوازیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو انہوں نے لکھنؤ کی یاد میں ایک یادگار نظم لکھی کہ ؎

عرش ساماں کیوں نہ ہو خاکِ دیارِ لکھنؤ
ہے بہارِ خلد سے بڑھ کر بہارِ لکھنؤ
مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی روحِ وقارِ لکھنؤ
ایک حسنِ نازنیں تڑپائے گا برسوں ہمیں
یہ خلش زندہ رہے گی یادگارِ لکھنؤ

لکھنؤ کی اس ماہ لقا سے شعر و سخن کے سلسلے میں اختر کی خط و کتابت دیر تک رہی ہے۔ اور ایک مرتبہ جب وہ لاہور تشریف لائیں، تو انہوں نے فلیمنگ روڈ پر اختر کے گوشۂ فقر و قناعت کو بھی اپنے قدوم سے

نوازا۔ اور اس سلسلے میں اختر کو جب پہلے پہل یہ معلوم ہوا کہ وہ لاہور آنے
کا ارادہ رکھتی ہیں تو وہ یوں غزل سرا ہوئے کہ ؎

کب تلک رونق شام اودھ اے ماہ رواں!
شام لاہور کو بھی صبح بنا دے آکر
ہو چکی سیر بہاراں کدۂ قیصر باغ
باغ لارنس میں بھی پھول کھلا دے آکر
گومتی دیکھ چکی جلوۂ عارض کی بہار
سطح راوی کو بھی آئینہ بنا دے آکر

اسی طرح حرم حسن کی یادگار امرتسر کی "نو بہار ناز" بھی ایک بہت
بلند پایہ اور معزز گھرانے کی ادب پرور خاتون ہیں۔ اختر کی ایک حسین اور
وجد آفرین غزل ان ہی سے متعلق ہے جو انہوں نے امرتسر میں ان کی
خدمت میں نذر کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر ذرہ اس کے حسن سے روشن ہے آج کل
امرتسر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل!
جس آستاں کو سجدۂ پروین بھی بار تھا
وہ آستاں جبیں کا نشیمن ہے آج کل
پھر بوئے گل سے آتی ہے اس گلبدن کی بو

پھر دل میں بے خودی کا نشیمن ہے آج کل

ان معززاور ادب نواز خواتین میں شیریں ہیں۔ خاک انبالہ کے قرب و جوار کے ایک بڑے ممتاز او بلند پایہ گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ اور بلا شبہ علم و ادب اور شعر و سخن میں آپ ملک کی مشہور ترین ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ اسی لیئے اختر آپ کی مدح میں ایک جگہ یوں نغمہ سرا ہیں کہ ؎

"صبا" کی بادۂ شیریں کا ہے کل ہند میں شہرہ
نہ کیوں اے دل غلام ساقیٔ میخانہ بن جاؤں

تقسیم ہند کے بعد شیریں لاہور آگئیں اور اب اسی عروس البلاد کے ایک پُربہار گوشے میں آپ کا مسکن ہے۔ اختر جب تک ٹونک رہے وہ آپ کو ہمیشہ خطوط لکھتی رہیں اور جب وہ لاہور آگئیں تو یہ سلسلہ ایک حد تک یہاں بھی جاری رہا۔ بلاشبہ رتبہ شناسان اختر میں آپ کا مرتبہ خصوصیت سے بہت ممتاز ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے ایک مرتبہ جب شیریں شملے تشریف لے گئیں تو اختر نے انتظار دعوت کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجی جس میں انہوں نے کہا کہ ع

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی!

اور پھر جب اسی اثنار میں وہ سولن چلی گئیں تو اختر نے یہ شعر انہیں لکھ کر بھیجا کہ ؎

تم تو سولن میں گزارو بھری برسات کی رات
اور کٹ جائے یہاں آنکھوں میں برسات کی رات

ایک مرتبہ اختر انبالہ سے رہ گزار شیریں کو دیکھ کر یوں غزل سرا ہوئے کہ ؎

دیکھ اے دل نظر آیا وہ دیار شیریں
ذرّے ذرّے سے مچلتی ہے بہار شیریں
مدد اے دیدۂ گریاں کہ نہیں صبر کی تاب
وہ نظر آنے لگی راہ گزار شیریں

پھر ایک جگہ اختر شیریں کی شان میں یوں نغمہ پیرا ہیں کہ ؎

مری روح رنگیں مری جان شیریں
تمنائے زرّین و ارمان شیریں
ترا رخ ہے برق سحاب بہاریں
ترے لعل لب ہیں گلستان شیریں
تخیّل ترا ایک وادی رنگیں!!!
تصوّر ترا اک خیابان شیریں

تری یاد اک جنتِ رنگ و بو ہے
ترا خواب اک یوسفستانِ شیریں
ہیں کاکل ترے ابرِ بارانِ نکہت
ہیں آنکھیں تری نرگستانِ شیریں
تری جعد مشکیں ہے خوابِ بہاراں
تری زلف ہے سنبلستانِ شیریں

ایک مرتبہ اختر نے شیریں کے ایک مکتوب کے جواب میں ایک منظوم خط لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا اور پھر شیریں نے یہ خط انہیں اس شکل میں واپس ارسال کیا کہ بعض اشعار پر نشان دے کر اشارات و کنایات کی زبان میں اُن پر حاشیے میں کچھ فقرے لکھے گئے تھے۔ ذیل میں یہ خط جو شیریں کی طرف سے ان فقروں سمیت، واپس ہوا عرض خدمت ہے۔ اس خط منظوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

"ایک خط کے جواب میں"

آپ نے یاد کیا یا در کھا شاد کیا
دل کے ویرانے کو احسان سے آباد کیا
ایک اک لفظ یہ کہتا ہے کہ دل نذر کرو
ایک اک حرف یہ کہتا ہے بدل صاد کیا

میرے[1] جذبات کی دنیا میں قیامت ہے بپا
آپ نے نامہ نہ لکھا مجھے برباد کیا
کس سے سیکھا ہے یہ انداز نگارش تم نے
کس ستم گر نے یہ طرز ستم ایجاد کیا
کیوں شکایت ہے مرے دل سے فراموشی کی
کون[2] کہتا ہے کہ میں نے نہ تمہیں یاد کیا
آپ کے نطق سے ہے بلکہ شکایت مجھ کو
جس نے میرے لب تشنہ کو نہ دلشاد کیا
بوسے لے اپنی زباں کے یہ کہاں ممکن ہے
نطق سے آپ نے کیونکر نہ یہ ارشاد کیا
پھر محبت نے گھٹاؤں سے صدا دی مجھ کو
پھر تصور نے مجھے مائل فریاد کیا
زہد[3] رخصت کہ ہے وہ شوخ کرم پر مائل
اتقا دور کہ اس بت نے مجھے یاد کیا
غیرت[4] اے جوش محبت ہوئی توہین شباب

---

[1] .... [2] اپنے دل ہی سے پوچھئے [3] اور اب — [4] بڑا ہی دل نشین شعر ہے، مگر یہ کہئے کہ پارسائی کا الزام غلط تھا؟ - (خیریں)

پارسا کہہ کے کسی بُت نے مجھے یاد کیا

ایک ہفتے سے پرافشاں ہے گھٹاؤں کا ہجوم
ایک ہفتے سے مجھے توبہ نے آزاد کیا

ان بہاروں میں بہک جاؤں تو مجبور ہوں میں
ان بہاروں نے مرے ہوش کو برباد کیا

عالم کیف میں دیوانہ ہوا ہوں اختر
کہ[1] ..... کو کسی ..... نے پھر یاد کیا

اختر کی چند ادب نواز اور قدر دان خواتین کا یہ تذکرۂ جمیل یہاں ضمناً آگیا۔ اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ ہم سب کچھ ایک علیحدہ کتاب میں لکھیں گے جس میں ہم وضاحت کے ساتھ بتائیں گے کہ سلمیٰ کی جدائی کے بعد اختر نے اپنی شاعرانہ زندگی گزارنے کے لئے کیا کیا حسین بہانے اختیار کر رکھے تھے۔ اور اس سلسلے میں وہ رنگین اور حسین خطوط بھی نذر خدمت کریں گے جو درحقیقت رومانی ادبیات اردو کی جان ہیں اور جنہیں اختر آخر عمر تک جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ آخر میں ایک دفعہ مرنے سے کچھ مدت پہلے انہوں نے ان مہکتے ہوئے خطوط کی نسبت

---

[1] اس معمے کے حل کے لئے کسی نے ایک مرتبہ ایک بیش قیمت انعام رکھا۔ مگر افسوس کہ یہ معمہ حل نہ ہو سکا۔ ([illegible])

ارشاد فرمایا کہ ؎

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر
آجتک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کے رنگین کلام کی یہ حسین یادگاریں جن کے اصل نام کچھ اور ہیں اور اختر کے سرمایۂ ادب میں فرضی ناموں سے یاد کی گئی ہیں، ملک کے بلند پایہ ادب نواز اور علم پرور طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ اور حجلہ نشینان سراپردہائے عفت ہیں، اختر اسی لئے ان کی شان میں یہ کہتا ہے کہ ع

خدا کا شکر ہے ہم شمع بے پردہ نہ رکھتے ہیں

ان علم و ادب کے اختر پرست مہ پاروں میں سے بعض کو اختر کے ساتھ شاید دلی لگاؤ رہا ہے۔ لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ وہ اختر کی نظموں میں حسن اور عالم نسواں کے لیئے اس کے احساسات اور بے پناہ طوفانِ جذبات کو دیکھ کر اس کی قدردان اور اس کے ہنر کی دلدادہ تھیں بعض کا معمول یہ تھا کہ اس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس کو خطوط لکھتیں اور چھیڑتی تھیں۔ بعض اس سے اپنے کلام میں اصلاح لیتی تھیں اور اس ضمن میں اکثر اپنے مکاتیب میں اس کے کمال فن کی ستائش

کر دیتی تھیں۔ لیکن یہ اختر کی سادگی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبت کی کار فرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سلمٰی کے بعد ان پرستاران اختر میں سے تقریباً سب کا تعلق اختر سے زیادہ اختر کے اشعار سے رہا ہے۔

لیکن اس باب میں ایک خاص چیز جو سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ سلمٰی کے عشق میں ناکامی کے بعد جو چیز انہیں اس جہان رنگ و بو میں جگہ جگہ لئے پھرتی تھی وہ درحقیقت سلمٰی ہی کے جمال دلفروز کی جستجو تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ اب یہ باقیماندہ عمر اسی طرح جستجوئے سلمٰی میں ختم ہو کر نثار رہ یار ہو جائے۔

بس وہ اسقستان لاہور کی عذراؤں یا یوسفستان سندھ کی زلیخا۔ آذر کدۂ امرتسر کی بجلیاں ہوں یا وادیٔ گنگ کے بہارستان کی چمپا، اختر ان سب میں سلمٰی ہی کے حسن و جمال کی بہاریں ڈھونڈتے اور ان پر نثار ہوتے تھے۔ وہ سلمٰی کے سچے عاشق تھے اور وہ چاہتے تھے کہ کہیں وہی جلوہ انہیں پھر ایک بار نظر آ جائے۔ جس نے انہیں ایک دن گجرات کی مقدس وادی میں سب سے بے ہوش کر دیا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے آپ ذیل کے واقعات پر غور کیجئے۔

ایک مرتبہ اس زلیخائے سندھ نے جس کا ذکر اوپر ہوا اختر کو ریلوے اسٹیشن لاہور پر دعوت ملاقات دی۔ گاڑی جب اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوئی تو اس نے کھڑکی سے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔ اختر اتنا ہی دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور فرمانے لگے کہ یہ تو سلمیٰ کا سا ساعد مرمریں ہے۔

پھر یوسفستان سندھ کی اس زلیخا کو آپ نے کئی جگہ سلمیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ جب وہ لاہور کے اسٹیشن سے گزرتی ہوئی سندھ سے شملے کی طرف روانہ ہوئیں تو آپ نے کہا کہ ؎

دامن بحر عرب کی کر کے سیر
میری سلمائے جواں آنے کو ہے

پھر اسی زلیخا کے خط کے سلسلے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ؎

وادیٔ سندھ سے اک دعوت عشق آئی ہے
کوئی سلمیٰ میرے سجدوں کی تمنائی ہے

اور پھر ایک جگہ شیریں کی یاد میں وہ یوں غزل خواں ہیں کہ ؎

عنبر افشاں ہوئی اس طرح سے ناطرۂ گل
کہ مجھے کوچۂ سلمیٰ کی فضا یاد آئی!

پس ان تمام امور کو سننے اور سمجھنے کے بعد یہ حقیقت ہمسر گل ذہن میں آجاتی ہے کہ اختر صرف سلمیٰ کا تھا اور ساری عمر سلمیٰ کا رہا اور

سلمیٰ سے جدا ہونے کے بعد چند برسوں تک یہ جو کچھ ہوتا رہا زندگی سے خوش گوار انتقام تھا۔ یا زندگی گزارنے کا ایک شاعرانہ طریقہ اور یا پھر حسن و جمال سلمیٰ کی جستجو کا ایک دل فریب مشغلہ اور بس۔

۱۲

جو بہاروں میں نہاں رنگِ خزاں دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے وہی سیرِ جہاں دیکھتے ہیں
ایک پردہ ہے غموں کا جسے کہتے ہیں خوشی
ہم تبسم میں، نہاں اشکِ رواں دیکھتے ہیں!
دیکھتے دیکھتے کیا رنگ جہاں نے بدلے
دیدۂ اشک سے نیرنگِ جہاں دیکھتے ہیں
رات ہی رات کی مہماں تھی بہارِ رنگیں
پھر وہی صبح، وہی جورِ خزاں دیکھتے ہیں!
ہر مسرت ہے غمِ تازہ کی تمہید اے دل
نغمۂ شوق میں آثارِ فغاں دیکھتے ہیں
دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اخترؔ
کوئی دن اور تماشائے جہاں دیکھتے ہیں

سلمیٰ اب لاہور سے باہر جا چکی تھی اور اب اختر کے لیئے ان کی راہ میں
وہ موانع و عوائق حائل ہو گئے تھے کہ سلمیٰ تک ۔ ان کی رسائی ایک حد تک
ناممکن تھی۔ گویا اب ان کے اور سلمیٰ کے درمیان ہزاروں کوسوں کا فاصلہ
تھا اور اس سفر میں سینکڑوں خندقیں اور دشوار گزار پہاڑیاں سدِراہ تھیں
کیف الوصول الیٰ سعاد و دونہا ۔ قلل الجبال و بینہن خیوف
اور اب صورت یہ تھی کہ اگرچہ اختر سے جدا ہو کر سلمیٰ بھی ہمیشہ مضطرب
پریشاں حال رہیں لیکن سلمیٰ کے غم جدائی میں درحقیقت اختر کی زندگی برباد
تباہ ہو گئی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جس دن سے اس کوچے سے نکلے تھے
انہیں چین اور آرام کا سانس میسر نہیں آ سکا یعنی ؎

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تیری ہی انجمن میں تھی

دل پر آلام و غموم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں کہ اسی اثنا میں ان کا
پہلا بچہ جسے وہ بے حد عزیز رکھتے تھے مر گیا۔ اور اس سے کچھ مدت بعد ان کے
عزیز ترین دوست شیون مرحوم کی خودکشی کا حادثہ پیش آیا جو ان کے لیئے
بے حد سوہانِ روح تھا۔ اس ہوش ربا سانحہ کا ذکر وہ ایک جگہ یوں کرتے ہیں
بعد از غم جدائی عذرا مرے لیئے ۔ یاد زبور ماتم شیون ہے آج کل

ترجمہ سعاد تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کی راہ میں پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کی گھاٹیاں حائل ہیں

اور پھر ایک جگہ شیون مرحوم کو وہ اپنا پیام شوق یوں بھجواتے ہیں ؎

شیون کو کوئی خلد بریں میں یہ خبر دے
دنیا میں اب اختر بھی ہے مہماں کوئی دن اور

پھر ان تمام مصائب پہ مستزاد اختر پر ان کے والد مرحوم کا عتاب تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گھر اختر سے بیزار تھا اور اختر گھر سے۔

اختر تمام عمر اور جگہ جگہ مسرت اور سکون کو ڈھونڈتے پھرتے رہے۔ لیکن اس زمین میں ان کے لیئے مسرت عنقا تھی۔ پس جب انہیں کہیں مسرت کا نشان نہ ملا تو وہ ایک دن انتہائی مایوسی کے عالم میں آسمان کے ستاروں کی طرف رخ کر کے یوں گویا ہوئے کہ ؎

مسرت آہ! تو بستی ہے کن ستاروں میں
زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے!

اور بالآخر اس دنیا میں جب وہ راحت اور مسرت کی زندگی سے قطعی طور پر مایوس ہو کر غموم و آلام حیات سے تنگ آ گئے تو انہوں نے ان سب کا علاج غفلت و بے خودی و خود فراموشی یا بالفاظ دیگر شراب میں ڈھونڈ نکالا کہ ؎

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوت آزار
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

کیونکہ ؎

یکے دواست بدار الشفائے میکدہا
زہر مرض کہ بنالند ش شراب دہند

چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ جس دن ان کے اکلوتے بچے کا انتقال ہؤا تو اس سانحہ کے اندوہ وغم کے ازالہ کے لیئے یہ علاج تجویز کیا گیا کہ اس دن انہوں نے اتنی شراب پی کہ بے ہوش ہو گئے۔

درحقیقت اختر بے حد نرم دل اور حساس انسان تھے۔ اسی لیئے سلمٰی کے غم مفارقت اور گھر کی تلخ زندگی نے انہیں کئی مرتبہ خودکشی کے لیئے آمادہ کیا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ کثرتِ بادہ کشی بھی جو بالآخر ان کی موت پر منتج ہوئی اسی خودکشی کے لیئے اُن کی ایک کامیاب کوشش تھی۔

اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح کی نہ تھی وہ تو ایک عجیب طرح کی مے کشی تھی جس کی نظیر ہم نے نہ دیکھی نہ سنی۔ ان کی عادت یہ تھی کہ جب دور کا آغاز کرتے تو بے تحاشا پیتے اور اکثر بغیر پانی ملائے پیتے اور عموماً سودیشی پیتے تھے۔ اور پھر جب دور شروع ہوتا تو عموماً دُو دُو ہفتے جاری رہتا۔ اور لطف یہ تھا کہ اس مدت میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی اور اس کے بعد دو چار دن کے لیئے ناغہ کرتے اور پھر یہی دور لازم ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مرنے

کی سعی نہ تھی تو ادر کیا تھا۔

اختر کی بادہ پرستی رسوائے کوچہ و بازار ہے۔ وہ علی الرؤس اور بہ بانگ کوس پیتے تھے۔ انہوں نے ساری عمر میخانے کی خدمت میں گزار دی یعنی ع

عمر ساری تری بھٹی پہ گزاری ساقی

اور عمر بھر خمخانے لٹائے یعنی ؎

عمر بھر اختر لٹائے میکدے
زندہ رسم خسرو و جم کر چلے!!!

اور اس غضب کی بادہ کشی کی کہ ایک مرتبہ پیر مغاں کو بھی کہنا پڑا کہ ع

اس طرح اپنی جوانی کو نہ برباد کرو

لیکن عمر بھر یہ کافر ان کے منہ سے چھٹنی تھی نہ چھٹی۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے کئی دوستوں نے جو خود تو "منکر مے" تھے لیکن ان کے ساتھ "ہمرنگ مستان زلیستن" کے اصل اصول سے باخبر تھے۔ انہیں بارہا مجبور کیا کہ وہ اس مشرب سے باز آجائیں ـــــ لیکن تمام کوششیں بے کار تھیں ـــــ برعکس اس کے اپنے ناصحوں سے ان کا کہنا یہ تھا کہ ؎

نہ چھیڑ زاہد ناداں شراب پینے دے
شراب پینے دے خانہ خراب پینے دے

ابھی سے اپنی نصیحت کا زہر دے نہ مجھے
ابھی تو پینے دے اور بے حساب پینے دے
میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ!
تو اس گناہ کو بے احتساب پینے دے
پھر ایسا وقت کہاں ہم کہاں شراب کہاں
طلسم دہر ہے نقش بر آب پینے دے
سمجھ کے اس کو غفور الرحیم پیتا ہوں
نہ چھیڑ ذکر ثواب و عذاب پینے دے
جو روح ہو چکی اک بار داغدار مری
تو اور ہونے دے لیکن شراب پینے دے

اور اپنے ساقی سے ان کا خطاب یہ تھا کہ ؎

تو زاہدوں کی نہ سن میکشوں کی خدمت کر
گنہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی

یا پھر بقول حافظ ان کا ارشاد یہ تھا کہ ؎

گر مے فروش حاجت رنداں روا کند
ایزد گنہ ببخشد و دفع بلا کند!!!

دوسرے دوستوں کی طرح میں نے بھی اس سلسلے میں بارہا کوشش کی

اور سچ یہ ہے کہ آخر میں اس باب میں مَیں ان سے قطعاً مایوس ہو چکا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ وہ اس عادت کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور یہی ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ترک مے کے لیئے حتمی وعدہ کرتے اور اس کے بعد جب پئے ہوئے آتے اور میں اُن سے کہتا کہ یہ آپ نے کیا کیا تو نہایت سادگی سے فرماتے کہ اس دفعہ حماقت ہو گئی۔ غرض بقول ان کے ان کی حالت یہ تھی کہ ؎

سینکڑوں بار مرے سامنے کی توبہ مگر
توبہ اختر کہ تری بادہ گساری نہ گئی

اصل بات یہ ہے کہ وہ شراب کے ہاتھوں کچھ ایسے مجبور تھے کہ رات کو توبہ کرتے اور صبح کو پھر پینے بیٹھ جاتے تھے کہ ؎

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم!
بہار توبہ شکن مے رسد چہ چارہ کنم

اور اس سلسلہ میں ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ کہیں نہ کہیں سے ان کے پاس ان کا کوئی ہم مشرب ایسا آجاتا تھا جو اُن کی توبہ کو ایک دو دن بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

لیکن اس کثرت بادہ کشی کا نتیجہ اب یہ تھا کہ اختر کی جسمانی صحت جواب

دے چکی تھی۔ اس پر سلمیٰ کی مفارقت، بچے کی موت، شیون کی خودکشی، گھر والوں کے عتاب اور دوستوں کی سرد مہری نے مل کر اُس کو غموں سے اور نڈھال کر دیا تھا۔ اور یہ غم و اندوہ کا دَور جاری تھا کہ اسی اثناء میں اختر مرحوم کے والد محترم پروفیسر محمود شیرانی اپنی مدت ملازمت کو ختم کر کے اپنے آبائی وطن مالوف ٹونک تشریف لے جانے کے لیئے آمادہ ہو گئے اور ان کے ساتھ اختر بھی مع اہل وعیال اپنے محبوب دیار سلمیٰ "لاہور" کو چھوڑنے پر مجبور کیئے گئے۔

لاہور کے گلی کوچوں میں اختر کی شاعری پیدا ہوئی پھلی پھولی اور جوان ہوئی۔ لاہور ان کی آرزوؤں کا مسکن بھی تھا اور مدفن بھی جس کی خاک کے ایک ایک ذرہ پر انہوں نے ساری عمر سجدے لٹائے۔ اس لیئے اختر کو لاہور کی جدائی کا اس قدر قلق اور صدمہ تھا کہ وہ اس کی مفارقت کے غم میں زار زار روتے تھے ــــــــ لیکن وہ جبراً لاہور کی حسین گلیوں سے لے جائے گئے جس طرح کوئی جہان سے لے جایا جاتا ہے۔ آہ میر ؎

یوں اُٹھے آج اس گلی سے ہم

جیسے کوئی جہاں سے جاتا ہے

غرض وہ "مثالِ شمع کے روتے اس انجمن سے چلے" اور ٹونک پہنچے

لیکن ظالم آسمان اس زمین پر بھی موجود تھا ع

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

چنانچہ ٹونک پہنچ کر بھی ان کے بے پناہ اور لامتناہی مصائب کا
سلسلہ ختم نہیں ہوا اور وہاں اب وہ سب سے پہلے جس صدمۂ جاں کا
سے دوچار ہوئے وہ ان کے والد محترم پروفیسر محمود شیرانی کا سانحۂ ارتحال
تھا جو اُن کے اور ان کے تمام اہل وعیال کے ہمیشہ کفیل رہے۔

اختر کے والد محترم اگرچہ ان کی عادات کی وجہ سے ان سے بیحد ناراض رہتے
تھے۔ لیکن اختر خود اپنے باپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ٹونک
پہنچ کر جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو
اس رند خرابات نے راستے میں جنازہ روک کر اور چارپائی کی پٹی پکڑ کر کچھ
اس انداز میں نالۂ و شیون اور نوحۂ و ماتم کے ساتھ اپنے دل کی تڑپ،
بے کلی اور محبت کا مظاہرہ کیا کہ یہ منظر دیکھ کر شہر کا ہر چھوٹا بڑا جو اس وقت
جنازے کے پاس موجود تھا زار زار رو رہا تھا۔

اس کے بعد دیر تک اختر اپنے والد محترم کے ماتم میں سوگوار رہے
اور مدتوں تک ان کا یہ مشغلہ رہا کہ راتوں کو اُٹھتے اور انہیں یاد کر کر کے
روتے تھے۔

لیکن اختر کے خانۂ انوری کے لیئے بلائے آسمانی اب ایک اور افتا

کی منتظر تھی کہ ؏

یک بیاباں بگذشت و دگرے درپیش ست

اور یہ اب ایک ایسا سانحہ تھا جس نے اختر کی بربادی میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بات یہ ہوئی کہ ٹونک میں اختر کا رود بناس کے کنارے ایک باغ تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنی کئی نظموں میں کیا ہے۔ ان کے والد پروفیسر محمود شیرانی انتقال کے بعد اسی باغ میں دفن کئے گئے ہیں۔ ایک دن ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اختر کی والدہ ماجدہ اور دوسرے گھر والے ان کی صاحبزادی اور داماد کو جن کی شادی کو ابھی چالیس دن ہی گذرے تھے۔ ہمراہ لیکر اس باغ میں تشریف لے گئے۔ صبح کا وقت تھا یہ لوگ کھانا ساتھ لیتے آئے۔ کیونکہ ارادہ ان کا یہ تھا کہ دوپہر کا کھانا وہیں کھائیں۔ پھر کچھ دیر سیر کریں اور بعد ازاں پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر سہ پہر تک گھر واپس آجائیں۔

چنانچہ جب یہ سب پروگرام کے مطابق کھانا کھانے بیٹھے تو اختر کے داماد نظیر الدین نہر بناس سے پانی لینے تشریف لے گئے۔ نہر کے کنارے پہنچ کر وہ نہر میں اترے اور ارادہ غالباً ان کا یہ تھا کہ آگے بڑھ کر صاف پانی حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ آگے بڑھے ہی تھے۔ کہ اچانک غرق ہو گئے۔ پاس ہی اختر مرحوم کا صاحبزادہ خو شنود کھڑا تھا وہ

یہ دیکھ کر زور زور سے بآواز بلند شور مچانے لگا۔ اس کی آواز سن کر فوراً
مرحوم کے گھر کی خواتین وہاں پہنچیں اور انہوں نے مالیوں کو جو قریب
موجود تھے آواز دی۔ مالی دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے نظیرالد
پانی سے باہر نکالا۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کی روح قفس عنصری سے
پرواز کر چکی تھی۔

بالآخر ماتمیوں کا یہ قافلہ زار زار روتا چالیس دن کے اس دولہا
لاش اور اس کی بیوہ کو ساتھ لے کر گھر پہنچا۔ اور جب یہ لاش دروازہ پر
رکھ دی گئی تو سب طرف ایک کہرام مچ گیا۔ اختر اپنے اس نوشہ کی صورت کو د
کے لیئے گھر سے باہر نکلے اور اس کی لاش پر کھڑے ہو کر اس قدر روئے
بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اور پھر جب کچھ ہوش آیا تو انہوں نے کچھ اس
دردناک انداز میں صدا لئے نالہ و فریاد بلند کی کہ ہر شخص جو اس منظر کو دیکھ
تھا ان کی نوائے درد کو سن کر تڑپ رہا تھا۔ اور بیتاب ہو ہو کر رو رہا

نظیرالدین (بی۔ ایس۔ سی مرحوم) بڑے تعلیم یافتہ، ہونہار، نیک سیر
پاک طینت اور خوبصورت نوجوان تھے۔ اور اختر مرحوم کو بے حد عزیز
اختر پر ان کی ناگہانی موت کا اس قدر گہرا اثر تھا۔ کہ وہ لاہور پہنچ کر اک
کی غرقابی کے حادثہ کو یاد کرتے اور زار زار روتے تھے۔ مرنے کے بعد
دن میں نے ان کی بیاض (شہر درد کے قلمی مسودہ) میں یہ قطعہ دیکھا جو مر

نے ان کے ماتم میں کہا ہے کہ ؎

ہے غرقِ ظلمتِ یاس آسماں آج
مہِ روشن ہے نظر و دل سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
اجل! ڈوبا نظیر الدین جواں آج
۱۲۶۶

غرض یہ ہیں وہ اسباب و عوامل جنہوں نے اختر کے جسم میں زندگی کے لئے قوتِ مقاومت کو باقی نہ چھوڑا اور اُن کی شمعِ حیات کو قبل از وقت گُل کر دیا۔

۱۳

لا پلا ساقی شرابِ ارغوانی پھر کہاں
زندگانی پھر کہاں نادان جوانی پھر کہاں

آ کہ ہم بھی اک ترانہ جھوم کر گاتے چلیں
اس چمن کے طائروں کی ہمزبانی پھر کہاں

ہے زمانہ عشقِ سلمیٰ میں گنوانے کے زندگی
یہ زمانہ پھر کہاں، یہ زندگانی پھر کہاں

ایک ہی بستی میں ہیں آساں ہے ملنا آ ملو
کیا خبر لے جائے دورِ آسمانی پھر کہاں

فصلِ گل جانے کو ہے دورِ خزاں آنے کو ہے
یہ چمن یہ بلبلیں یہ نغمہ خوانی پھر کہاں

آج آئے ہو تو سنتے جاؤ یہ تازہ غزل
ورنہ اختر پھر کہاں یہ شعر خوانی پھر کہاں

سلمیٰ کے جانے کا غم جدائی اور اُن پیہم مصائب و نوائب نے جنہیں ہم نے ذکر کیا اختر کی زندگی کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اور اب ان کی جس قدر عمر گزری وہ گریہائے شبہائے تار اور نالہائے سحر میں کٹی۔ اپنی اس حرماں نصیب زندگی کا نقشہ انہوں نے کیا خوب کھینچا ہے کہ ؎

وہ پھول ہوں جو کھلا ہو خزاں کے موسم میں
تمام عمر مجھے حسرت بہار رہی !!!

چنانچہ اب صورت یہ تھی کہ جوانی ختم ہونے کو آئی۔ لیکن دورِ فراق ختم ہونا تھا نہ ہوا ؎

دریغ مدت عمرم کہ بر امید وصال
بسر رسید و نیامد بسر زمانِ فراق

بایں ہمہ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ سلمیٰ کی وفا سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ جب تک جئے وعدۂ حشر کے باوجود یہاں ہمیشہ ان کا انتظار کرتے اور انہیں یوں پکارتے رہے کہ ؎

اے خرّم از فروغ رخت لالہ زار عمر
باز آ کہ ریخت بے گل رویت بہار عمر
از دیدہ گر سرشک چو باراں رود رواست
کاندر غمت چو برق بشد روزگار عمر

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

تو ساتھ ہو تو کون و مکاں کو گم کر دوں
خم طرب میں جم آسماں کو گم کر دوں
دوئی ہو فرد تو دونوں جہاں کو گم کر دوں
بہ رنگ روح بدن میں سما بھی جا سلمیٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یا پھر وہ اپنی سلمیٰ کو اپنی شبہائے تار فراق میں یوں دعوت وصال دیتے رہے کہ ؎

نکہت زلف سے نیندوں کو بسا دے آکر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سلا دے آکر
فکرِ فردا و غم دوش بھلا دے آکر
پھر اسی ناز سے دیوانہ بنا دے آکر
کس قدر تیرہ و تاریک ہے دنیائے حیات
جلوۂ حسن سے اک شمع جلا دے آکر
عشق کی چاندنی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
عمر رفتہ کو مری مجھ سے ملا دے آکر
زندگی جن کے تصور سے بنی ہے سلمیٰ!

موت اک پردہ ہے یہ پردہ اُٹھا دے آکر
تیری فرقت میں مرے شعر ہیں کتنے غمگیں
مسکراتی ہوئی نظروں سے ہنسا دے آکر
پھر وہی ہم ہوں وہی دن ہوں وہی راتیں ہوں
عہدِ رفتہ کو پھر آئینہ دکھا دے آکر

لیکن جیتے جی اختر کی یہ آرزوئے خام پوری ہونی تھی نہ ہوئی آہ ؎

گداختِ جاں کہ شود کار دل تمام و نشد
بسوختیم دریں آرزوئے خام و نشد

تاآنکہ اس مست صہبائے عشق نے ساقیٔ ازل سے آخری جام طلب کیا کہ ؎

دورِ گردوں آمدہ آخر دریں بزمے بمن
ساقیا برخیز و درِدہ آخریں پیمانہ را

اور اس کے بعد یہ بزم میکدہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ع
ہو گئی بزم میکدہ خاموش

سلمٰی کی مفارقت کے بعد سے عنفوان شباب ہی میں اس شاعر رومان نے موت کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں کئی منظ

انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بھری جوانی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اور اس وقت
ایک شعر میں انہوں نے اپنی اس آرزو کو اس طرح ظاہر کیا کہ ؎

بزمِ ہستی سے نکالے گئے اختر کیا جلد
ابھی پینے بھی نہیں پائے تھے پیمانے چند

درحقیقت شیب سے پہلے عالمِ شباب میں مرنے کی انہیں بے حد آرزو تھی اور اس لیے وہ چاہتے تھے کہ (میری زبان میں) عشق کے کاموں سے شتابی سے فارغ ہو کر اور خم خانے میں جو کچھ حریفوں نے باقی چھوڑ دیا ہے اسے پی کر جلد از جلد موت کی میٹھی نیند سو جائیں اس باب میں بطور عنوان جو نظم درج ہے وہ اُن کے اسی احساس کی ترجمان ہے۔ اور اس جذبہ کا اظہار وہ ایک اور جگہ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ ؎

بھلا پھر کب ملے ہم کو بہارِ نوجوانی
پلا ساقیا بادۂ ارغوانی !!!!

اس کے علاوہ انہوں نے ایک شاعرِ نوجواں کی تربت پر جو نظم لکھی ہے اس کا ایک ایک حرف اُن کی اس جواں مرگی کی تمنا کا آئینہ دار ہے ملاحظہ ہو ؎

دامانِ [illegible]زار میں ہے — اک شاعرِ نوجواں کی تربت
[illegible] میں ہے — اک نکہتِ رائگاں کی تربت

آتی نہیں اس طرف ہوائیں — شاداب و شگفتہ پھول لے کر
زائر نہیں اشک جو بہائیں — سینے میں دلِ ملول لے کر

ممنونِ بہار کی نہیں ہے — کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے
بے کس کا یہ مرقدِ حزیں ہے — بیگانہ گلاب و یاسمیں سے!

پر ہے چشمِ بصیرت آشنا کو — مل جائے جو رخصتِ تماشا
اور غور سے گورِ باصفا کو — دیکھے تو ہے عبرتِ تماشا

شاعر کے الم گسار ہیں جمع — تربت پہ ہجوم ہو رہا ہے
شمع و دلِ داغدار ہیں جمع — اور جام بھی خون رو رہا ہے

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں — راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا
وہ جام کہ جس کو زندگی میں — وہ بادۂ لالہ گوں سے بھرتا

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ الفت — اور آج بھی خوگرِ جفا ہے
پیوست تھا جس میں تیرِ الفت — جو پھول کی طرح جانفزا ہے

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے ۔۔۔ آئینۂ رونمائے سلمیٰ!!
یا موت کو گُدگُدا رہا ہے! ۔۔۔ نظارۂ جاں‌فزائے سلمیٰ

شاعر کو مگر نہیں خبر کچھ ۔۔۔ وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اس پر نہیں حال کا اثر کچھ ۔۔۔ جاگا تھا غریب سو رہا ہے

لیکن اب جب کہ اُن کی جوانی ـــ ڈھلا چاہتی تھی تو اس وقت ان کے دل میں موت کے لیئے آتشِ شوق اور بھی تیز ہو گئی تھی اور اب.... اختر کی زبان پہ صبح بہار کی رنگینیوں اور رومانی راتوں کی شادابیوں کا تذکرۂ جمیل نہ تھا بلکہ اکثر غم و الم، ہجر و فراق، یاس و حرماں اور ناکامی و نامرادی کا افسانہ تھا۔ جو وہ اپنے ہر شعر میں اپنے انداز خاص میں بیان کرتے تھے چنانچہ اس وقت وہ ایک جگہ اپنی ناکام اور حسرت ناک زندگی پر یوں نوحہ خواں ہیں کہ ؎

حسرتوں سے اپنا دامن بھر چلے
ہائے اس دنیا میں ہم کیا کر چلے!

پھر ایک اور مقام پر وہ اپنی موت کا ماتم اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

فصلِ گل آئی، گئی، ختم کر چکے ۔۔۔ اے محبت تیرا ماتم کر چکے
بعد مردن کیوں ہو رنج احباب کو ۔۔۔ جیتے جی ہم اپنا ماتم کر چکے

اور ایک اور موقع پر وہ اس احساس کا اظہار کہ "جہاں کو بس مر
پروردگار دیکھ چکے" اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

فصلِ گل دیکھ چکے دورِ خزاں دیکھ چکے
ہم تماشائے گلستانِ جہاں دیکھ چکے
دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اختر
خوب جی بھر کے تماشائے جہاں دیکھ چکے

پھر ایک اور نظم میں اس سیہ خانۂ ہستی میں اپنی چند روزہ مہمانی
پیش گوئی اور آرزو کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں کہ ؎

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور
مر جائیں گے جب ہم تو بہت یاد کرے گی
جی بھر کے ستا لے شبِ ہجراں کوئی دن اور
تربت وہ جگہ ہے کہ جہاں غم ہے نہ حیرت
حیرت کدۂ غم میں ہیں حیراں کوئی دن اور
یاروں سے گلہ ہے نہ عزیزوں سے شکایت
تقدیر میں ہے حسرت و ارماں کوئی دن اور
پامالِ خزاں ہونے کو ہیں مست بہاریں

ہے سیرِ گل و حسن گلستاں کوئی دن اور

ہم سا نہ ملے گا کوئی غم دوست جہاں میں

تڑپائے غم گردشِ دوراں کوئی دن اور

قبروں کی جو راتیں ہیں وہ قبروں میں کٹیں گی

آباد ہیں یہ زندہ شبستاں کوئی دن اور

آخر کو وہی ہم وہی ظلماتِ شبِ غم

ہے نورِ رخ ماہِ درخشاں کوئی دن اور

آزاد ہوں عالم سے تو آزاد ہوں غم سے

دنیا ہے ہمارے لئے زنداں کوئی دن اور

اور پھر ایک اور جگہ ایک بڑے حسرت ناک انداز میں اپنی موت کے بعد کے مناظر کا نقشہ وہ یوں کھینچتے ہیں کہ ؎

چمن زار شاداب و خنداں رہیں گے درختوں پہ طائر غزل خواں رہیں گے

فضاؤں میں بادل پر افشاں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

گھٹائیں گلستاں پہ چھایا کریں گی فضائیں یونہی لہلہایا کریں گی!

درختوں کے دامن گل افشاں رہیں گے

مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

چمن کی فضائیں مہکتی رہیں گی　صبا کے اثر سے لہکتی رہیں گی
گل و غنچہ و برگ رقصاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے　صداؤں سے معمور ہستے رہیں گے
بپا زندگانی کے طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

گھٹائیں یوں ہی لہلہایا کریں گی　یوں ہی بلبلیں گیت گایا کریں گی
یوں ہی گلستاں گل بداماں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

عروسِ سحر روز آیا کرے گی　فضا نور سے جگمگایا کرے گی
مناظر سحر خیز و خنداں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی　ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ روشن چراغاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

کہستاں سے چشمے اُبلتے رہیں گے　سرِ راہ موتی بکھلتے رہیں گے
یہ سیلاب سیمیں خراماں رہیں گے

مگر ہم تہ خاک پنہاں رہیں گے
غرض یہ خدائی کے رنگیں نظارے
یہ شام و سحر کے بہاریں نظارے
خراماں و درخشاں تاباں رہیں گے
مگر ہم تہ خاک پنہاں رہیں گے

حقیقت یہ ہے کہ اب ہمارا یہ رند تلخ نوش اس دنیا کے بے پناہ آلام و مصائب کی وجہ سے جلد از جلد موت کا تلخ گھونٹ پی کر اس جہان سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ اور ادھر کثرت مصائب و نوائب کے علاوہ کثرت مے گساری کی وجہ سے اس کی صحت بھی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ زیادہ مدت تک مے سال خوردہ سے اپنے غم کہن کا مداوا کرتا رہے۔

اختر جوانی میں بے حد تنومند و توانا اور حسین و خوبصورت نوجوان تھے لیکن اب آخر میں صورت یہ تھی کہ گوشت ہڈیوں سے جدا ہو رہا تھا۔ اعضائے رئیسہ و شریفہ جواب دے چکے تھے۔ بالخصوص آلات انہضام نے بہت حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا اور بقول ان کے دل تباہ و جگر مجروح رہی اور جگر برباد آبادی دونوں بے حد ماؤف ہو چکے تھے اختر اب ہمہ مصائب و آلام اور عشق کی ناکامیوں سے قطعاً

کے باعث بے حد نحیف و نزار ہو چکے تھے اور گویا زمانے نے ان کی حالت اب یہ بنا دی تھی کہ ؎

غریب و عاشق و بیدل فقیر و سرگرداں کشیدہ محنتِ ایّام درد ہائے فراق

اصلاح عوارض و احوال کی بہت کوشش کی گئی لیکن بے سود۔ کیونکہ ان کے مرض کے لئے جس دوا کی ضرورت تھی وہ تو کچھ اور ہی تھی کہ ع

دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

وہ ایک جگہ خود کہتے ہیں کہ ؎

اختر نہیں ہے دردِ محبت کا کچھ علاج ہو کوئی اور درد تو نیّر دوا کریں

بالآخر اس شہیدِ عشق کی آرزو بر آئی کہ تقریباً تینتالیس[۴۳] سال کی عمر ہی میں جب کہ اس کا شباب اس سے رخصت طلب کر رہا تھا۔ وہ شاعرِ عشق پیشۂ مشرق ـــــ زیارتِ جمالِ سلمیٰ کی تمنا دل میں لئے ہوئے ہمیشہ کے لئے اس دارِ فنا سے رخصت ہو گیا۔ ہائے ؎

لوگ کہتے ہیں مر گیا اختر
آہ وہ عشق پیشہ شعر طراز

۱۴
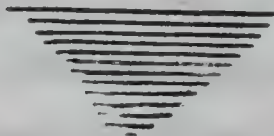
سوز پھر چھیڑتا ہے روح کا ساز
ذرہ ذرہ ہے اک نوائے گداز
دل نے کھائے بہت فریبِ مجاز
آہ، او فطرتِ بہانہ طراز
زندگی کی حقیقت آہ، نہ پوچھ
موت کی وادیوں میں اک آواز
آہ، او عمرِ رفتہ تنہا ہوں!
موت کی گھاٹیوں سے دے آواز

لاہور سے جدا ہونے کے بعد اختر کئی سال تک ٹونک رہے اور اگرچہ اس اثنا میں اپنے کاموں کے سلسلے میں وہ دو تین بار چند روز کے لئے لاہور آئے، گئے، لیکن ان کا دل لاہور سے کبھی سیر نہ ہوا۔ اور اس زمانے میں جب تک وہ ٹونک رہے بڑی حسرت سے لاہور کو یاد کرتے رہے۔

اسی دور میں ایک جگہ انہوں نے اپنے لاہور سے آنے والی النسیم کا ذکر خیر
اس طرح کیا ہے کہ ؎

ہیں وطن میں رہ کے بھی بے وطن کہ نہیں ہے کوئی بھی ہم سخن
ہے کوئی شریک غم و محن تو وہ اک نسیم شمال ہے

اختر حافظ کو شاعری کا پیمبر سمجھتے تھے اور اُن کے دیوان کو شاعری
کی کتاب مقدس۔ اور ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ وہ بھی کنار رکنا باد پر
بیٹھے نسیم شمال ہی سے دل کی باتیں کیا کرتے تھے کہ ؎

خوش خبر باش اے نسیم شمال
کہ بما مے رسد زمان وصال

بالآخر حالات نے کروٹ لی اور اب تقسیم ہند کے بعد اختر لاہور آنے
کے لئے مجبور ہوئے۔ چنانچہ انتقال سے تقریباً چھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک
بلا اطلاع وہ لاہور تشریف لے آئے۔ رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔
آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرمانے لگے کہ بس اب میں لاہور آگیا ہوں اور
اب یہیں رہوں گا۔

درحقیقت اُن کی آمد کا مجھے ایک مدت سے انتظار تھا۔ کیونکہ میں
سمجھتا تھا کہ وہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں زیادہ مدت تک ٹونک

نہ رہ سکیں گے۔ اور یوں بھی ٹونک کا ریاستی ماحول اُن کے اور اُن کی شاعری کے لیئے کچھ ایسا سازگار نہ تھا۔ چنانچہ وہ وُہاں اب جتنے دن رہے بادل ناخواستہ رہے اور پریشاں خاطر رہے۔

اُسی زمانے میں ایک دن یہ مشہور ہوُا کہ اختر ٹونک سے پنجاب آ رہے تھے کہ راستے میں مع اہل و عیال شہید کر دیئے گئے۔ اور یہ اطلاع بڑے زور شور سے یہاں کے اخبارات میں نشر ہوئی۔ اس پر میں نے مرحوم کی والدۂ محترمہ کو لکھا کہ یہاں اس طرح کی خبرِ وحشت اثر سننے میں آ رہی ہے۔ اختر نے اس کا جواب میرے اطمینان کے لیئے خود اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا کہ میں زندہ ہوں اور مرنے سے پہلے آپ کو اپنے مرنے کی اطلاع دوں گا۔

اُس وقت تو مَیں اسے ایک تفنن سمجھا۔ لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک مذاق نہ تھا بلکہ ایک سچی بات تھی جو اُس وقت اس مجذوب کی زبان قلم سے نکلی تھی۔

بات یہ ہوئی کہ مرنے سے چار پانچ دن اور ہسپتال لے جانے سے ایک دو دن پہلے میں نے اُن سے باتوں باتوں میں کہا کہ اختر صاحب! میرے دواخانے کا ایک کارکن سخت بیمار ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ مر جائے گا۔ فرمانے لگے کہ حکیم صاحب! اس کے ساتھ میں بھی مر جاؤں گا۔

اب میں اسے بھی ایک تفنّن سمجھا کیونکہ اس وقت تک ان کی طبیعت اتنی خراب نہ تھی کہ ایسا گمان کیا جا سکتا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ دواخانے کا کارکن جو میرا رشتہ دار بھی تھا مر گیا اور اُس سے اگلے دن اختر بھی راہیٔ ملکِ بقا ہوئے تو اس وقت میں نے محسوس کیا کہ رندِ خرابات نے جو کچھ کہا تھا وہ تو غیب کی آواز تھی —— اور پھر جب مجھے ان کا وہ خط یاد آیا جس میں مجھے انہوں نے لکھا تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور مرنے سے پہلے آپ کو اطلاع دوں گا تو میں اس وقت سمجھا کہ مرحوم نے مجھے اپنے مرنے کی اطلاع دے کر اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

پھر اسی اثنار میں ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ اختر مرنے سے تین چار روز پہلے ایک دن فرمانے لگے۔ کہ میرے بیوی بچے ٹونک سے چل پڑے ہیں اور یہاں آکر یہ مجھے ملیں گے۔ اور ہوا بھی یہی کہ اختر ادھر بسترِ مرگ پر لیٹے اور اُدھر ان کی رفیقۂ حیات بچوں کو ساتھ لے کر ٹونک سے پاکستان روانہ ہوئیں اور بالآخر اختر کی پیش گوئی کے مطابق سندھ ہوتی ہوئی اس وقت لاہور پہنچیں۔ جب کہ یہ تمام عمر کا موت کا آرزو مند عروسِ مرگ سے ہمکنار ہو کر ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا ؎

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی

میں ماضی قریب میں لاہور میں اختر کی آمد کا ذکر کر رہا تھا کہ ضمناً اس رند خرابات کی پیش گوئیوں کا تذکرہ آ گیا۔ اور یہ حکایت دراز تر ہو گئی۔ لہذا پھر سے قصۂ زلف پریشاں کی طرح اس داستان یار کو اس طرح شروع کرتا ہوں۔ کہ جب یہ یوسف گم گشتہ مصر لاہور میں واپس آیا تو دل کو خصوصیت کے ساتھ اس لیئے بڑی خوشی تھی کہ دوست کو زندہ و سلامت دیکھا اور یہ مسرت اس لیئے اس بار کچھ اور زیادہ تھی کہ خیال تھا اختر اب ہمیشہ لاہور رہیں گے۔ لیکن ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

آہ! اختر واقعی اب لاہور ہی میں ہیں اور اب وہ لاہور کی رنگین فضاؤں اور بہاروں میں ہمیشہ محو خواب استراحت رہیں گے۔

اختر اب لاہور پہنچ کر میرے غربت کدہ پر اقامت گزیں ہو گئے اور اس کے بعد اب بھی مشغلہ ان کا وہی تھا جو ہمیشہ رہا، یعنی دن رات پینا دن بھر غائب رہنا اور رات کو آنا اور جاگنا اور دوستوں اور تمام محلہ والوں کو جگانا کہ ع

خاقانی را دگر شب آمد!

البتہ اس دوران میں کما سے گزرے ایسا بھی ہوا اختر الم زدہ

بے خودی میں سلمیٰ کے محلہ کی گلیوں کی طرف نکل جاتے اور وہاں اِدھر اُدھر
خاک چھان کر واپس آجاتے کیونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ سلمیٰ آج کل لاہور آئی
ہوئی ہیں اور اگرچہ یہ بات تو صحیح تھی لیکن چونکہ ایک تو انہیں گلی کا صحیح صحیح پتہ
نہ چلا دوسرے وہ خود انہیں ایک ایسے عالم میں ڈھونڈنے نکلتے تھے جس
میں انہیں آپ اپنی خبر نہ تھی۔ اس لیئے وہ اکثر نشہ میں جھومتے معلومہ محلہ کی
گلیوں میں چکر لگاتے رہتے۔ اور بالآخر جب تھک جاتے تو گھر واپس
آجاتے۔ اور عالمِ مایوسی میں یوں غزل سرا ہوتے کہ ؎

کس نمے داند کہ راہ منزلِ سلمیٰ کجاست
ایں قدر دانم کہ دردِ بیقرارم دادہ اند

اس کے علاوہ اس اثناء میں ان میں کچھ اور عجیب و غریب چیزیں
دیکھنے میں آئیں جنہیں میں اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کرتا ہوں۔
ایک چیز یہ تھی کہ وہ اس مرتبہ ہندوستان کے فسادات سے اس قدر
متاثر تھے کہ جب کبھی ان مصیبتوں کا ذکر آتا جو ایک کو دوسرے کے ہاتھوں
اٹھانی پڑیں تو وہ اکثر بے چین ہو کر تلملا اُٹھتے اور رونے لگتے تھے
اور اس ضمن میں اکثر سیاسی مسائل پر مذاکرہ فرماتے حالانکہ نہ یہ ان کا میدان
تھا۔ نہ کبھی وہ سیاست کی پُرخار وادیوں میں گامزن ہوئے۔ اور نہ کبھی

وہ سیاسی مسائل میں الجھے، ــــــ لیکن اس مرتبہ ان مصائب سے تاثر کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے اس عہد کی سیاست اور دورِ پُرفتن پر متعدد نظمیں لکھیں۔ اور ان نظموں میں ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ؎

ہر ایک شاخ کو گلچیں نے کر دیا ویراں
سکوتِ بیکسئ گلستاں کو کیا کہئے

پھر اُس وقت ان کے لیئے یہاں لاہور میں مہاجروں کی آمد اور ان کی پریشاں حالی کا دردناک منظر اور ایک بڑی مصیبت بنا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ سیر کرتے کرتے کبھی راوی روڈ کی طرف نکل جاتے اور وہاں ایک کیمپ میں مہاجرات کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھتے تو گھڑے کھڑے زار زار رونے لگتے۔ اس وقت ان ہی حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے مہاجرہ کے عنوان سے ایک رمانیٹ لکھا جو شہر و دیں درج ہے۔

پھر اُس وقت ایک اور خاص چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ یوں تو اختر ابتدا ہی سے بے حد رقیق القلب واقع ہوئے تھے مگر مرنے سے کچھ مدت پہلے ان کی حالت یہ تھی کہ وہ بات بات پر رو پڑتے تھے۔ وہ خود اپنی اُس وقت کی اس کیفیت کو ایک شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

روتا ہے بات بات پہ یوں بار بار کیوں
اختر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا

ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے ایک شعر پڑھ دیا کہ سہ

کہاں ہے رونے والا بیکسوں کی قبر پر کوئی
غنیمت ہے ترا اے شمع! چار آنسو گرا لینا

شعر کا سننا تھا کہ اختر تڑپ گئے اور دیر تک زار زار روتے رہے۔
علاوہ ازیں میں نے سنا کہ اُس زمانے میں جب آپ باہر کہیں اپنے
دوستوں سے ملنے جاتے تو اکثر ان کے پاس دنیا کی بے ثباتی کا حال بیان
کرتے اور پھر خود روتے اور ان کو بھی رُلاتے تھے۔
غرض یہ کہ ہر وقت ہنسی اور قہقہوں میں زندگی بسر کرنے والا اختر جب
اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ اس کی مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کر اور تماشائے
نیرنگیٔ جہاں دیکھ دیکھ کر بے حد رقیق القلب ہو چکا تھا ـــــ تاآنکہ د
کہیں افق کے پار کسی نامعلوم بستی کی طرف روتا ہوا چلا گیا۔ اور اپنے پیچھے
رونے والوں کی ایک دنیا چھوڑ گیا جو رہتی دنیا تک اُسے روتی رہے گی آہ ع

شعر سے کرد بزاری و برفت از بر ما

پھر اس زمانے میں ایک اور نئی چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ اپنے اہل و
عیال کو بہت زیادہ یاد کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے ایسا بہت کم
دیکھا گیا۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ حکیم صاحب! میں نے اپنی بیوی کو

کوئی حق ادا نہیں کیا۔ اور پھر اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔

اور ایک دن آپ نے اپنے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے وقت اپنے صاحبزادہ خوشنود کی نقلیں اتارنے لگے ــــــ اور پھر فرمانے لگے کہ ہائے میں نے اپنے بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اور اس کے بعد اس قدر روئے کہ دیر تک روتے چلے گئے یعنی ؎

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

اور اس اثناء میں اکثر ایسا ہوتا کہ جب ٹونک سے کوئی خط آتا تو دیر تک اُسے ہاتھ میں لئے بیٹھے رہتے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ اختر صاحب! خط پڑھ لیجئے۔ فرمانے لگے کہ یوں تو ہمت نہیں، پہلے کچھ پی لوں، پھر پڑھوں گا

اسی زمانے میں ان کی ایک صاحبزادی کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا کہ والدہ کہتی ہیں تم تو پردیس میں جاکر آرام سے بیٹھے ہو اور ہم یہاں تکلیف میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو اس پر آپ نے ایک سانیٹ لکھا جس میں آپ ایک جگہ اپنی رفیقۂ حیات سے یوں خطاب کرتے ہیں کہ ؎

تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ ملال آتا ہے
آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے

اور پھر ایک مرتبہ جب آپ کی رفیقۂ حیات نے لکھا کہ تم ہمیں لاہور جاکر بھول گئے تو اس پر آپ نے پیمانِ وفا کے عنوان سے ایک سانیٹ لکھا

جس کا ایک شعر یہ ہے کہ ؎

بر ربّ کعبہ نہ پائے گی جب کہیں تم کو
ہر ایک ذرّہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تم کو

یہ دونوں سانیٹ شہرود میں درج ہیں۔

پھر اُس زمانے میں ایک اور عجیب بات یہ مشاہدہ میں آئی کہ مرنے سے چند روز پیشتر اُن کے اکثر دوست آتے اور ان کو باہر لے جاکر اُن کی تصویریں کھنچواتے تھے۔ اخیر ان میں سے اکثر تصویریں اپنے ساتھ لے آتے اور یہاں آکر تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن یہاں آپ ——————— یہ تصویریں تقسیم کرتے وقت فرمانے لگے کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ اس مرتبہ میں تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔

اور اس دوران میں ایک اور خاص بات یہ دیکھی گئی کہ ان دنوں آپ پر عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد غلبہ تھا۔ یوں تو ہم نے اس سے پہلے بھی آپ کو باایں ہمہ رندی و خراب حالی عشق رسولؐ میں سرشار دیکھا ہے۔ لیکن اس مرتبہ تو یہ عشق جنون کی حد کو پہنچا ہوا تھا ——— چنانچہ جب بھی نام پاکؐ آتا آپ دیوانہ وار جھومتے اور روتے تھے۔ اور پھر دیر تک روتے چلے جاتے تھے۔ شہرود میں آپ کی نعتوں کا ایک خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ جو آپ کے ان ہی جذبات شوق کا آئینہ دار ہے اور انہیں

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رند غزل خواں عشقِ رسول کی بدولت سرکارِ مدینہ اور گلزارِ مدینہ کی ثنا خوانی میں بھی اپنا جواب آپ ہی ہے۔

پھر ان امور کے علاوہ ایک اور عجیب چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ ان دنوں آپ پر سچ مچ مجذوبوں کی سی حالت طاری تھی اور یہ کچھ ایسا دور تھا کہ اس وقت کسی نے کچھ جانا اور کسی نے کچھ بھی نہ پہچانا۔ بہر حال اس وقت کچھ وقت کے لیئے ان کے ارادت مندوں میں سے بعض ایسے خوش عقیدہ لوگ بھی پیدا ہو گئے تھے جو واقعی ان کو مجذوب سمجھ کر اُن سے غیب کی باتیں پوچھتے تھے اور کہتے ہیں کہ بعد میں ان کی پیش گوئیاں سچی ثابت ہوتی تھیں اور اب تک صحیح ثابت ہو رہی ہیں ؎

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ہم قبل ازیں عرض کر چکے ہیں کہ سلمیٰ کے داغِ فراق اور مسلسل مصائبِ زمانہ کی وجہ سے اختر کے کلام میں یاس و غم، اندوہ و الم اور حسرت و حرماں کے مضامین کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ اور اب جب کہ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں میرے غربت کدہ پر اقامت گزیں ہو کر فکرِ شعر میں مصروف تھے تو اس دور میں خصوصیت سے یہ چیز ان کے کلام میں بہت زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ اختر کا ہر شعر اُن کی زندگی کا افسانہ ہے اور اسی لیے
وہ خود یہ کہتے ہیں کہ ؎

میرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تصویر
دیکھنے والوں نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

پس اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح شکل میں نظر آئے گی کہ
اختر کی زندگی جس قسم کے حوادث وسوانح میں سے گزرتی گئی۔ اُن ہی کے
سانچے میں ان کی شاعری بھی ڈھلتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ اختر جو عشق سلمیٰ کے ابتدائی
دور میں بہار عیش کے نغمے الاپتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اب اس عہد ناکامی
میں اپنی نامرادی اور بربادی پر مصروف نوحہ وماتم نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے
اُس کی اِس دور کی شاعری کی نسبت دوسری رائے قائم نہیں کی جا سکتی
کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس کی شاعری اب حالات کے زیر اثر نغمہ شادی
کی جگہ نوحۂ غم میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اب اپنے اس خاص رنگ میں بھی
انتہائی اوج کمال پر تھی۔

اختر کی شاعری کے مختلف ادوار پر بحث ونظر کا یہ مقام نہیں۔ لیکن یہ
ایک حقیقت ہے کہ جس طرح اس کی رومانی شاعری کا پہلا دور اس ہنگامہ آباد
ہستی میں نغمۂ طرب اور زمزمۂ وصال کی محفل آرائیوں کی حیثیت سے عدیم النظیر
تھا۔ اسی طرح اس کا یہ دوسرا عہد بھی سوز وگداز، زار نالی اور اظہار تاثرات

جذبات غم و الم کے اعتبار سے اپنا جواب آپ تھا۔ چنانچہ اس عہد کے ہر شعر میں ناکام عشق اختر نے اس غمکدۂ حیات میں اپنے ارمانوں کی پامالی کی پوری کہانی بیان کی ہے جس کے ہر لفظ میں اس کے دل کی تڑپ محسوس ہوتی ہے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں کہ ؎

ہے نشاط لالہ و گل میں کیا ہے بہار سرو و سمن میں کیا
مجھے کب دماغ ہے سیر کا ہیں کہ دل لگا جا کے چمن میں کیا

پھر ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

نہ وہ رنگ باغ جہاں رہا نہ وہ کیف عمر جواں رہا
نہ وہ ذوق بزم مغاں رہا نہ وہ شوق کوئے بتاں رہا

پھر اسی رنگ میں ایک غزل کا ایک اور مطلع ملاحظہ ہو ؎

نہ تمہارا حسن جواں رہا نہ ہمارا عشق جواں رہا
نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے جو رہا تو غم کا سماں رہا

پھر ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو اُن کے مرنے سے اگلے دن جبکہ ساری دنیا ان کے ماتم میں سوگوار تھی شہر و دیس میری نظر سے گزرا کہ ؎

بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں اک دن
کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں اک دن

پھر اس دور میں ایک جگہ اپنی نامرادیوں کا ماتم وہ یوں کرتے ہیں ؎

شاداب کر سکا نہ گلستان آرزو
کتنے ہی ابر باغ پہ چھا کر چلے گئے
آنسو نہ تھم سکے مری چشم امید کے
کتنے ہی موسم آئے اور آکر چلے گئے

ایک اور جگہ وہ اپنے دور ماضی کی بہاروں کو ۔ یوں یاد کرتے ہیں کہ ؎

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے
وہ عمر کیا ہوئی وہ زمانے کدھر گئے
دن رات میکدہ میں گزرتی تھی زندگی
اختر وہ بے خودی کے فسانے کدھر گئے

پھر ایک جگہ وہ اس دنیا کے مصائب سے تنگ آکر یوں رقمطراز ہیں کہ ؎

مر گئے ہم آخر کو اس طرح بھی کیا جیتے
زندگی کا ہر لمحہ موت کا فسانہ تھا

ایک مقام پر وہ اپنی قسمت کی نسبت یوں گلہ گزار ہیں کہ ؎

رنگ کیا کیا فلک پیر نے بدلے لیکن
میری تقدیر کہ یہ رنگ بدلتی ہی نہیں

پھر ایک مرصع نظم میں وہ ع "آمر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں" کی صدا لگا کر اپنے لئے ۔ ایک حسین ترین موت کو پکارتے ہیں۔

اور ایک اور مقام پر وہ ایک عجیب حسرت ناک انداز میں اپنی بھولنے والی سے یوں مخاطب نظر آتے ہیں کہ ؎

بھلاؤ گے بہت لیکن تمہیں ہم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیں گے پھر بھی بہت کم یاد آئیں گے
بھلا بیٹھے ہو ہم کو آہ لیکن یہ سمجھ لینا!
بہت پچھتاؤ گے جس وقت کل ہم یاد آئیں گے

ایک جگہ وہ اپنے ساقی سے یوں التجا کرتے ہیں کہ ؎

پلا دے جتنی چاہے اب تو مہماں ہیں کوئی دم کے
جرس کا شور گونجا کارواں طیار ہے ساقی

اور اس باب میں سب سے زیادہ "غور کرنے کی چیز" وہ نظم ہے جو اختر نے رخصت دائمی کے عنوان سے اپنی بھولنے والی کے لیئے بطور یادگار چھوڑی ہے کہ ؎

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے — بہار لے گئے یاد بہار چھوڑ گئے
ہماری چشم حزیں کا خیال کچھ نہ کیا — وہ عمر بھر کے لیئے اشکبار چھوڑ گئے
نہ آیا رحم مرے آنسوؤں کی منت پر — کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے
نگاہ درد کی عرض حزیں قبول نہ کی — ہمیں وہ غمزدہ و دل فگار چھوڑ گئے
تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں — یہ نقش گیسوئے مشکیں بہا چھوڑ گئے

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اختر نے مرنے سے کچھ مدت پہلے جب یہ اشعار
کہے تو برسات کا موسم تھا اور آسمان پر گھنگور گھٹائیں چھائی رہتی تھیں۔ اب
اس ماحول اور منظر کو سامنے رکھ کر اس نظم کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے کہ ؎

گھٹائیں چھائی ہیں ساون ہے مینہ برستا ہے
وہ کس سمے میں ہمیں اشکبار چھوڑ گئے

اور آخر میں تو اس باخبر مجذوب نے ایک جگہ صاف ہی کہہ دیا کہ ؎

امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل
امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

اور پھر شہرود میں ان کے ناتمام کلام میں ایک جگہ ہم یوں لکھا
ہوا دیکھتے ہیں کہ

رخصت اے بزم جہاں

۱۵

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
ہے جنوں اہل جنوں کے لئے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

اختر کا سانحۂ ارتحال یوں پیش آیا کہ اس مرتبہ بھی آپ نے حسب معمول بے تحاشا پینا شروع کر دیا اور جیسا کہ آپ کا دستور تھا آپ نے دس بارہ روز کے

بعد یکدم ترک کر دیا۔ ہر مرتبہ ترک کے بعد آپ پر ردِ عمل کی کیفیت طاری
ہوا کرتی تھی جس میں آپ بے خوابی، بے چینی، اختلاج، غثیان وتہوّع
اور شدید اضطراب کی اذیتیں محسوس کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ حالت اس
مرتبہ بھی رونما ہوئی۔ لیکن جسم ناتواں چونکہ اب زیادہ مدت تک اس صورتِ
حال کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیئے اس مرتبہ عوارض ذرا زیادہ شدید
نوعیت کے تھے۔ مثلاً اس بار بول وبراز بند ہو گیا اور شدید قسم کا
یرقان پیدا ہو گیا تھا۔ جو جگر کے فعل کے صحیح نہ رہنے پر دلالت کرتا تھا۔
ایک شب میں نے کوشش کی کہ احتقان کے ذریعہ اجابت کرائی
جائے۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ بالآخر انہیں میں نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو
دکھایا۔ اور چونکہ اُن کی بھی یہی رائے تھی کہ عوارض کی شدت کا تقاضا یہ
ہے کہ انہیں ہسپتال داخل کرایا جائے۔ لہذا میں انہیں ہسپتال لے
گیا۔

ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد اُن کی حالت یہ تھی کہ وہ دُو دن
تک اچھے رہے۔ بلکہ ایک دن تو اُن کی طبیعت اس قدر بہتر معلوم ہوتی تھی
کہ جب میں انہیں ملنے گیا تو وہ فرمانے لگے کہ مجھے اب گھر لے چلیئے ــــ
مگر معالجوں کی رائے یہ تھی کہ وہاں ابھی اور رہنے دیا جائے۔
لیکن ایک دن مجھے یہ معلوم ہوا کہ اختر صاحب کی طبیعت ہسپتال

میں یکدم بگڑ گئی ہے اور وہ کچھ دیر تک حکیم صاحب حکیم صاحب پکارتے رہے اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں فوراً ہسپتال پہنچا اور وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ واقعی اختر صاحب بیہوش ہیں۔ اس قدر بے ہوش کہ وہ اب مجھے پہچان بھی نہیں سکتے۔ میں نے کئی مرتبہ بلند آواز سے اختر صاحب کو پکارا۔ لیکن وہ اب اس قدر بے ہوش تھے کہ وہ میری بات نہیں سن سکتے تھے۔ پھر میں نے چہرہ کو بار بار دیکھا، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے کچھ کہنا چاہا لیکن آہ ـــــ اب وہ مجھ سے آنکھیں پھیر چکے تھے ـــــ

غرض ایک دو دن اُن پر اسی طرح بے ہوشی اور سکرات کی سی حالت طاری رہی اور اس اثنا میں ایک آدھ بار کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ان کی حالت تدریجاً بہتر ہو رہی ہے۔ لیکن یکایک ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو اُن کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کے ہونٹ پھڑکنے لگے اور تقریباً پندرہ منٹ تک پھڑکتے رہے۔ میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ اس ڈاکٹر کو جو اس وقت ان کے حالات کی نگرانی پر متعین تھا خیال ہوا کہ اختر شاید کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کیا تو اگرچہ ان کی آواز اس وقت اس قدر کمزور تھی کہ صحیح طور پر کچھ سمجھنا دشوار تھا۔ تاہم اس نے محسوس کیا کہ اختر اپنی جاتی ہوئی دنیا کو

اپنا کوئی آخری پیغام دے رہے ہیں۔ اور یہ بالآخر سب سے آخر ہیں بڑی
مشکل سے اس نے جو الفاظ سنے وہ یہ تھے

ہو گئی بزم میکدہ خاموش

اب . . . .

شاعر نے یہ کہا اور اس کے بعد وہ رند لم یزل میخانے کے راستے
سے ہوتا ہوا ہمیشہ کے لئے اس سرائے فانی سے رخصت ہو گیا ؎

براہ میکدہ حافظ خوش از جہاں رفتی
دعائے اہل دلت باد مونس دل پاک

پاس ہی اُس وقت چارپائی کے قریب میرے اور ان کے دو پرانے
ساتھی کھڑے تھے جو یہ منظر دیکھ کر زار زار رونے لگے اور گویا اُس وقت حال
صورت یہ تھی کہ ؎

اس طرف کچھ سوچ کر رونے لگے تیماردار
اُس طرف بیمار غم کچھ کہہ کے غافل ہو گیا

اختر نے جب اس دنیا کو الوداع کہا تو مجھ اسی وقت ایک ڈاکٹر
دوست کے ذریعہ یہ روح فرسا اطلاع پہنچ گئی۔ چنانچہ میں جس قدر
جلد ہو سکا نالاں و گریاں ہسپتال پہنچا۔ چونکہ اس وقت شام ہو چکی تھی

اس لیئے خیال ہوا کہ اگلے دن اس جسد گرامی کو سپرد خاک کیا جائے۔ کہ اچانک لاڑکانہ (سندھ) سے مرحوم کی رفیقۂ حیات کا تار آ گیا کہ ہم سب لاہور پہنچ رہے ہیں۔ اور اس لیئے اب یہ مناسب سمجھا گیا کہ سر دست مرحوم کے جسم کو میو ہسپتال کے برف خانے میں بطور امانت رکھوا دیا جائے اور جب ان کے اقربا یہاں آ جائیں اس وقت دفن کیا جائے۔

اب اس سے دو دن بعد ان کی والدۂ ماجدہ، رفیقۂ حیات اور ان کے دو بچے لاہور پہنچ گئے۔ آتے ہی ان کی والدۂ مکرمہ نے (جنہیں قبل ازیں تار کے ذریعہ صرف ان کی علالت سے مطلع کیا گیا تھا) پوچھا کہ اختر کہاں ہے؟ عرض کیا گیا کہ ہسپتال میں ہیں؟

غرض جوں توں کر کے رات ختم ہوئی اور جب صبح ہونے لگی تو انہیں بتدریج بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ضرور موجود ہیں ـــــــ لیکن موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں ـــــــ ان سب کا یہ سننا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا اور بیوہ ماں، بیوی اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے دل فگار نالوں نے ایک قیامت بپا کر دی۔

اس کے بعد صبح ہوئی اور سورج نکل آیا۔ تو مرحوم کے جسد کو ایک تابوت میں رکھ کر گھر لایا گیا ـــــــ دکھیا ماں نے جب اپنے لخت جگر بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو بچھاڑ کھا کر فرشِ خاک پر گر پڑی

چھوٹے چھوٹے دونوں یتیم بچے زمین پر تڑپنے لگے۔ اور بدنصیب بیوی اپنے شوہر کے تابوت کو پکڑ کر یوں مصروفِ نالہ و بکا ہوئی کہ ؎

خاک میں مل جائے گی صورت تمہاری ہائے ہائے
میری قسمت میں لکھی تھی یہ بھی خواری ہائے ہائے

اپنی رخصت کا ابھی سے دل کو گر دینا تھا غم
پہلے کر لینی تھی کچھ دن غمگساری ہائے ہائے

کس لیئے مرجھا گئے ہنستے ہوئے ہونٹوں کے پھول
مرنے والے کیا ہوئی وہ لالہ کاری ہائے ہائے

آہ جن آنکھوں میں بستی تھی کبھی صورت تری
اب وہی آنکھیں ہیں صرفِ اشکباری ہائے ہائے

شمعِ تربت کی طرح اے کاش میں بھی جل بجھوں
تیرے غم سے کس قدر ہے شرمساری ہائے ہائے

اس کے بعد مسافرانِ حزیں کا یہ تباہ حال قافلہ اس تابوت کو لپٹ کر کچھ اس طرح رویا کہ جس جس نے یہ دردناک منظر دیکھا ان لوگوں کی فریاد

معلوم ہوتا ہے کہ اختر نے اپنی یہ نظم "شوہر کے تابوت پر" شاید اسی دن کے لیئے اور اپنی ہی رفیقۂ حیات کے لیئے لکھی تھی۔ منہ

بکا کو سن کر تڑپ اٹھا اور زار زار رونے لگا۔

اس کے بعد شہید عشق کا یہ جنازہ دل میں داغ حسرت دیدار لیئے گورستان میانی کی طرف چلا کہ ع

ترے جہاں سے چلے دل میں دل کی بات لیئے

لیکن ابھی یہ تابوت ایک گاڑی میں چند قدم آگے بڑھا ہی تھا۔ کہ ایک عجیب دل ہلا دینے والا منظر آنکھوں کے سامنے آیا۔ یعنی دیکھنے والوں نے اب قدرت کا یہ کھیل بھی دیکھا کہ حسن کو عشق کی بے بسی اور مظلومیت پر رحم آ گیا اور اپنے اختر کو بھولنے والی جسے یاد کر کے ایک دن اختر نے یوں کہا تھا کہ

اپنے بھولنے والے کو کب ہم یاد آئیں گے

آج اختر کی یاد میں بے قرار ایک برقع میں ملبوس آنمودار ہوئی اور آتے ہی حکم دیا کہ جنازہ کو روک لیا جائے —— جنازہ رُکا اور سب لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے —— پھر وہ اس کے قریب آئی۔ چہرہ سے نقاب اُلٹا۔ دیر تک منہ دیکھا۔ اور دل سے دل کی زبان میں جو کچھ اس نے اس سے کہنا تھا کہا۔

اب حالت یہ تھی کہ اُدھر حسن اپنے شہید محبت سے یہ راز و نیاز کی

باتیں کر رہا تھا اور اُدھر ہر وہ شخص جو اس دردناک منظر کو دیکھ رہا تھا عشق کے انجام اور اس کی جناب میں حسن کی اس نیازمندانہ عقیدت کو دیکھ کر ششدر و حیراں تھا ــــــ دل دھڑک رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عرش الٰہی کانپ رہا ہے اور ملاءِ اعلیٰ میں ایک کہرام بپا ہے۔

اس کے بعد یہ تابوت ایک چارپائی پر رکھ کر کچھ دُور کاندھوں پر لے جایا گیا۔ لیکن بعد ازاں اُسے پھر اس گاڑی میں رکھ دیا گیا جو اُس کے لئے مخصوص تھی۔ اور اب اس گاڑی میں ملک اور وقت کے سب سے بڑے رومانی ادیب اور شاعر یعنی شہید عشق حضرت سلمٰی اختر شیرانی کا یہ تابوت اس عالم میں اُن کے محبوب شہر "لاہور" کی سڑکوں سے گزر رہا تھا کہ آگے آگے یہ تابوت تھا اور پیچھے پیچھے اُس کے دو تین عزیز تھے یا گنتی کے چند دوست اور پرانے ساتھی۔ اور بس۔ آہ ؏

دُہائی دے رہی تھی بیکسی شاعر کی میت پر

اور ان چند ساتھیوں میں مَیں غم نصیب بھی جو تازہ زخم جدائی یار سے سینہ فگار تھا غم فراق دوست میں بے چین اس کے لئے خدائے رحیم و کریم سے عفو و کرم کی دعائیں مانگتا ہوا قبرستان میانی کی طرف جا رہا تھا ــــ

گفتم اکنوں سخن خوش کہ بگوید با ما
کاں شکر لہجہ خوشگوئے سخنداں مے رفت
پادشاہا ز کرم از سر جرمش بگذر
چہ کند سوختہ از غایت حرماں مے رفت

شہر کے بازاروں سے گزرتا ہؤا یہ جنازہ شہرستان فنا یعنی گورستان میانی کے قریب پہنچا۔ آہ ؎

جاگ اے دل آگیا شہر فنا
منزل ہستی میں کافی سو چکے

جنازہ اب قبرستان میں لے جایا گیا اور وہاں پہنچ کر اختر کے ماتم گساروں کا قافلہ نماز جنازہ سے فارغ ہو کر قبر کی تیاری کے انتظار میں ایک جگہ فرش خاک پر بیٹھ گیا ــــــ تاکہ اپنے اختر کو جس کے ساتھ عمر کا ایک بہت بڑا حصّہ بسر ہؤا ہے آخری بار الوداع کہا جائے۔

اور اب منظر یہ تھا۔ کہ ایک طرف اختر کے دوستوں کا یہ خستہ حال کارواں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہؤا تھا اور دوسری طرف جوانمرگ اختر کا وہ جنازہ رکھا ہؤا تھا جس پر اس کی جوانی اسی کی زبانی یوں نوحہ خواں تھی کہ ؎

مقصد فصل جوانی تھا یہی عشق میں ساری جوانی کھو چکے

اور ہاں ابھی اس کاروانِ غم کو آکر بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہی گزری تھی کہ اتنے میں بہشت حسن کی وہی حور نظر آئی جو قبل ازیں اس جنازے پر اپنی محبت کا جام کوثر لے کر آئی تھی - اور اب ایک ٹانگے میں بیٹھی اُس سڑک کے قریب سے جہاں یہ جنازہ رکھا ہوا تھا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بار بار آجا رہی تھی۔

اس کے بعد دوستوں نے اختر کو قبر میں اتارا اور اختر اپنی سلمیٰ کا داغِ محبت اپنے سینے میں لئے حشر تک کے لیئے خاکِ لحد میں سو گئے کہ ؎

درقیامت کہ سر از خاکِ لحد برگیرم

سرِ سودائے توام مستِ سویدا باشد

یاروں نے فاتحہ پڑھی اور بصد حسرت و الم واپس لوٹے لیکن اب اختر کی قبر تنہا رہ گئی - صرف ایک بے کسی تھی جو اس پر یوں چلا رہی تھی کہ ؏

کہاں ہے رونے والا بیکسوں کی قبر پر کوئی

اور صورت اب یہ تھی کہ کسی کی یاد میں اس جہان سے گزرنے والے اختر کی تربت کسی کی پابوسی کا انتظار کر رہی تھی کہ ؎

بوفائے تو کہ بر تربتِ حافظ بگذر

کز جہاں مے شد و در آرزوئے روئے تو بود

چنانچہ معلوم ہوا کہ وہی سوگوار اختر جو تدفین کے انتظار میں اس سے پہلے اس کے جنازے کے پاس سے بار بار گزر رہی تھی ——— اب اپنے شہید عشق کی قبر پر محبت اور ارادت کے پھول لیکر پہنچی ——— اور

قبر پر آیا ہے وہ پیکر ناز
عمر رفتہ کو دے کوئی آواز

اور اس کے بعد اس نے وہ پھول جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی اختر کی تربت پر رکھ دیئے ——— اس وقت اس شہید محبت کی قبر پر حسرت و یاس کا ایک عجیب منظر تھا ——— اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اختر نے یہ اشعار اسی دن کے لئے کہے تھے کہ ؎

جب مری قبر پہ وہ پھول چڑھانے آئے
موت کی نیند کے ماتوں کو جگانے آئے
کوئی اس وعدہ فراموش سے اتنا کہتا
آپ اب کس لئے روٹھوں کو منانے آئے
آب لیے شہر خموشاں میں ملے خاک میں ہم
آپ کیوں خاک کو پھولوں سے بسانے آئے
شمع کی طرح جلاتے تھے ہمیں فرقت میں
اب مری قبر پہ کیوں شمع جلانے آئے

ایک دن تھا کہ مجھے در سے اُٹھا دیتے تھے
اب دعا کے لیئے کیوں ہاتھ اُٹھانے آئے
جب میں روتا تھا مرے رونے پہ ہنس دیتے تھے
اب مری یاد میں کیوں اشک بہانے آئے
تم تو اک دن مرے شکوے بھی نہ سن سکتے تھے
اب مجھے کیوں غم دل اپنا سنانے آئے

ہاں تو جب عشق اپنی جان پر کھیل کر اپنی عظمت کا ثبوت دے چکا اور حسن اس کی تربت پر اپنی عقیدت و محبّت کے پھول لے کر پہنچا تو جس وقت یہ پھول چڑھائے جا رہے تھے شام ہو چلی تھی. سورج کی سرخ اور سنہری کرنیں ان پھولوں کو زندگی کی روشنی بخش رہی تھیں۔ اور آفتاب حسن کی خونناب بار آنکھوں کے آنسو انہیں سیراب کر رہے تھے ——— اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قبر کی زمین کانپ رہی ہے۔ آسمان تھرا رہا ہے، آفتاب خون برسا رہا ہے ——— ماضی بے چین ہے کہ ایک بار پھر لوٹ آئے اور زمانہ بے قرار ہے کہ سلاسل لیالی و ایام اتار پھینکے ——— رنگ و بو کی کائنات میں ایک کہرام برپا تھا ——— اور عشق کے فرشتے قدرت کی شان بے نیازی کا یہ نظارہ دیکھ

گر سر بسجود تھے کہ ع

کہ سبحان حیّ الذی لا یموت

اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھ فاتحہ کے لئے اٹھے اور اب قبر کی مٹی کے ڈھیر کی طرف ان سوگوار آنکھوں ــــــ اور فاتحہ کے لئے ان طلائی ہاتھوں کا اٹھنا تھا ــــــ کہ ایسا محسوس ہوا۔ کہ خدائی کانپ اٹھی۔ فضائیں بیتاب التجا ہو گئیں۔ اور اختر کی قبر اور کفن کے پھول کھکھلا اٹھے ــــ آہ ــ

دستِ حنائی کس کے اٹھے فاتحہ کو یہ

شاداب ہو رہے ہیں ہمارے کفن کے پھول

اور اب اس کے بعد وہ جانِ بہار آنسو برساتی ہوئی۔ رخصت ہو گئی کہ ع

چڑھ گئی پھولوں کی چادر ہو گئی پوری مراد

لیکن شہید کی تربت اب پھر اپنے قاتل کی آمد کا انتظار کر رہی تھی کہ ؎

قتیلِ عشق تو شد حافظ غریب ولے

بخاک ما گذرے کن کہ خون مات حلال

چنانچہ خبر ملی کہ انہوں نے پھر کچھ مدت کے بعد اختر کی خاک لحد کو اپنے قدوم سے نوازا ـــــــ لیکن اُس وقت جب کہ اُس کا مزار لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹ چکا تھا ـــــــ آخر اختر کی یہ پیشگوئی بھی تو پوری ہونی تھی کہ ؎

جب نشاں تک نہ رہا قبر کا میری باقی
تب مری قبر پہ وہ زود فراموش آیا

اور اس کے بعد جب ایک دن میں عید کے روز اختر کی قبر پہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ واقعی اس کی تربت بہت حد تک بے نشان ہو چکی ہے گویا اختر کی یہ آرزو پوری ہو رہی تھی کہ ؎

اختر اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو

صرف ایک جگہ خاک کا ایک چھوٹا سا ابھار نظر آیا جو دنیا والوں سے عبرت کی زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ع

مدتوں رویا کرے گا آسماں میرے لیئے

دیر تک حسرت و یاس کے عالم میں وہ محو و کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا اور اس کے بعد اپنے ان دو شعروں میں خدائے حیّ و قدوس سے اُس کے

لیئے مغفرت کی دعائیں اور اس کے نام کے لیئے بقائے دوام کی التجائیں
کرتا ہوا گھر واپس آیا کہ ؎

الٰہی اُس کی تربت خلد زار نور ہو جائے
نسیم شہر خاموشاں شمیم حور ہو جائے
لحد کو اس کی یارب یاسمن زار جناں کر دے
اور اس کے نام کو نقش حیات جاوداں کر دے

(لیکن اب قبر کو ایک حد تک صحیح حالت میں بنا دیا گیا ہے
اور آئندہ ارادہ یہ ہے کہ اس جسد گرامی کو جو یہاں بطور
امانت رکھا ہوا ہے کسی بہتر جگہ منتقل کر دیا جائے)

خاتمۂ کلام

اختر مرحوم کی زندگی سے متعلق یہ جو کچھ لکھا گیا درحقیقت اُس دولت مستعجل کی تاریخ حیات کے چند ابواب ہیں جو اُن کے کلام کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ ابتداءً ارادہ یہ تھا کہ سردست ان کی حیاتِ معاشقہ سے متعلق چند واقعات کو چند صفحات میں لکھ کر ختم کر دیا جائے اور پوری کہانی اس وقت لکھی جائے جب ان کی مکمل داستان حیات مرتب کی جائے۔ لیکن اس وقت بھی جب میں ان کی زندگی کے یہ چند رومانی حالات و سوانح لکھ کر فارغ ہوا تو دیکھتا ہوں کہ ایک کتاب بن گئی یعنی ع

افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شد

یہاں ان صفحات میں میں نے اختر مرحوم کے کلام اور عہد حاضر کی بزم سخن میں ان کی انفرادیت پر بحث و نظر کا کام بھی ——— اس وقت پر چھوڑ دیا جب کہ ان کی داستانِ حیات لکھی جائے گی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ یہ کام تو ایسا ہے کہ صدیوں تک ہوتا رہے

گا۔ اور جب تک اردو علم و ادب زندہ ہے دنیا ان کے کلام
تبصرہ کرتی رہے گی۔ سر دست ضرورت اس امر کی ہے کہ جس
ممکن ہو ان کی زندگی کے بعض رومانی حوادث و حالات قلمبند
جائیں۔ اور میں خوش ہوں کہ یہ کام ایک حد تک ہو گیا۔ اگرچہ
کام کا بہت تھوڑا حصّہ ہے جو میرے پیش نظر ہے۔